راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا ۱۴واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

ستمبر 2012ء

جلد:14 شمارہ:7

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

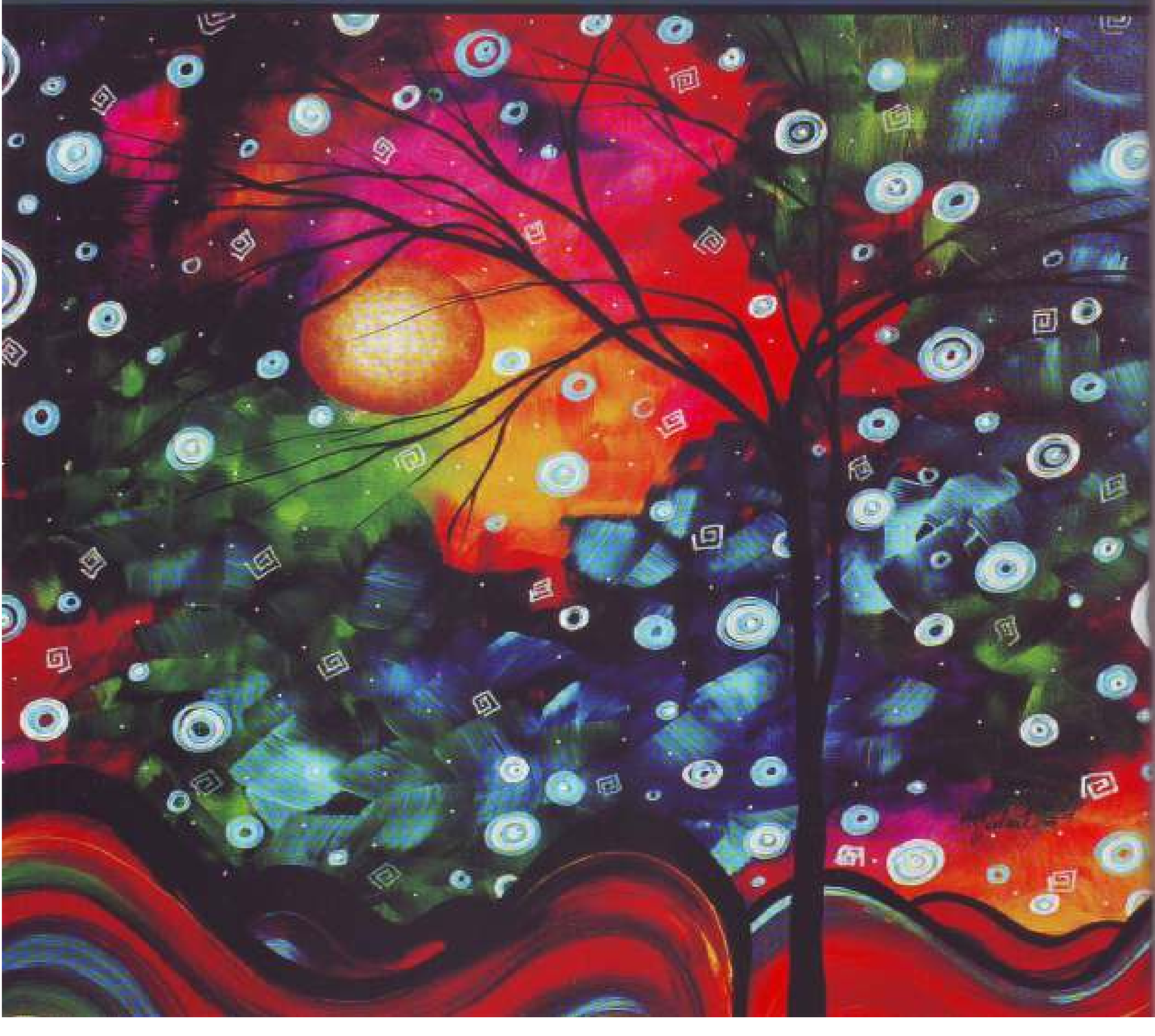

A different colour to Urdu literature

By: Dr Amjad Parvez
Muhabbat Kei Do Rang
By: Amir Bin Ali
Nasta'aleeq Matbooaat, Lahore; Pp 128; Rs 200

The book titled 'Muhabbat Kei Do Rang' by Amir Bin Ali is basically filled with translations of poems by Gabriela Mistral (1889 - 1957) and Pablo Neruda (1904 - 1973). The question arises as to why these two Western poets have been selected by Amir Bin Ali, who is a Pakistani by origin and presently resides in Japan. Perhaps it is because of the hardships Gabriela Minstral faced in her childhood in Chili that impressed Amir Bin Ali. Gabriela Minstral was the first Latin American who received a Nobel Prize in 1945. She was three when her father died and at the tender age of fifteen she had no option but to leave her education mid-way and become assistant teacher in a school in order to support her family.

Gabriela had adopted her name from two of her favourite poets, Gabriele De Anunczio and Fredrick Mistral. Due to the turmoil she faced she had to change three cities during the period 1906 to 1912. In 1918 she became a school director in Ponte Arena. In 1920 she met Pablo Neruda in Temuco. She accepted a scholarship from Mexicans and left Chili for good. Her first book 'Tanhai' ('Loneliness') was published in New York. In one of her poems, she used 'circle' as metaphor, the poem is titled 'Sab Daira Hei'. The poem says that all the stars are like boys who are playing. The wheat crops are like a girls swaying her waist. The rivers are like boys playing in circles who dare to play games with the seas and storms. The sea waves are like girls playing in circles who have lifted the earth in their hands and the earth is proud to exist. According to Dr. Anwaar Ahmad, Amir Bin Ali has seen the present day ripe for celebrating the works of two greats in the domain of romantic poetry. That is why he named his book as 'Muhabbat Kei Do Rang' (the two colours of love)

The second legend that Amir has chosen for translation in Urdu is Pablo Neruda. He was ten when his first poem was published. He was twenty when he became a poet of international repute and his first book 'Muhabbat Ki Bees Nazmain' (Twenty poems of love) was published. He remained strong and pursued his career as a poet even when his father did not support him. As a result, he got jobs in embassies in Yangon, Columbia, Jawa in Asia and then in Beunis-Iris and Barcelona. He replaced Mistral as Councillor in Madrid where he saw his friend Garcia Lorca getting murdered by General Franco which turned Neruda into a communist. Neruda's life story was revealed to the world when Neruda received the Nobel Prize for literature. After 1948 as the communist Party was banned, Neruda went underground and managed to flee to Argentine. Neruda also travelled to Europe, China, India, Russia and Ceylon on the passport of his look-alike Megal, who also became a Nobel Laureate later on. In Mexico, he managed to get its nationality. A novel was written in 1956 and a film titled 'The Postman' was made in 1994 based on this trip made by Neruda. He returned to his country in 1953 and remained there till his death.

His sense of passion is clearly visible in his poems. In his poem 'Jalta Chand' and 'Bhari Aurat Aur Phal' ('Burning moon' and 'Blooming woman and fruit') (Page 76) he disclosed the passion with which he loved his beloved in such a bold manner by saying that even if she appears in front of him with many of her lovers clinging to her body, he was still ready to start afresh with her. Amir bin Ali is himself a poet and columnist who has always desired to bring his country's educational, political and economic system at par with that of Japan. His promise to his country is that of love and that is why he has chosen to translate the selected works of the resistance poet, political come literary personality Pablo Neruda and Gabriela Minstral. By doing so, in the words of Dr. Anwaar Ahmad, Chairman Muqtadra, through his book Amir bin Ali has brought two influential colours of poetry in the limelight. In conclusion, the book under review introduces a totally different colour to Urdu literature!

(Courtesy: Daily Time)

اور مت پروو سچائی کو جھوٹ سے، نہ چھپاؤ سچائی کو جب تم جانتے ہو (القرآن)

MONTHLY ARXANG LAHORE

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 14 ستمبر 2012ء شمارہ نمبر 7

مدیر

حسن عباسی

مدیران اعزازی

ڈاکٹر صفدر اصدف، ابرار ندیم

ڈپٹی ایڈیٹرز (اعزازی) زبیر بشیر، صفدر علی صفدر (کویت)

اسسٹنٹ ایڈیٹر کامران ندیم

گوشۂ حمد	نورین طلعت عروبہ ' ۲
گوشۂ نعت	ریاض ندیم نیازی ' ۳
مضامین	
کیا کوئی اور شہزاد احمد بھی ہے؟	عطاء الحق قاسمی ' ۴
ہیلو ہیلو......ٹرن ٹرن......ٹووں ٹووں	حافظ مظفر محسن ' ۵
انٹرویو انور مسعود	عامر بن علی ' ۷
متفرق شاعری ' ۹ تا ۱۰	
افسانے	
بچے، باپ اور بیڈروم	دستگیر شہزاد ' ۱۱
آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک	ثمینہ سیّد ' ۱۳
اجنبی کی ڈائری سے	شہزاد ملک ' ۱۶
انٹرویو خورشید مستانہ	عامر بن علی ' ۱۹
فوزیہ غزل اہم ناول نگار	رائے عابد علی ' ۲۱
محبت کے جزیرے میں	خورشید بیگ میلسوی ' ۲۳
ایک شاعر کے نمائندہ اشعار	انتخاب: صائمہ ملک ' ۲۵
شعری گوشے	
احسان اللہ ثاقب، اعزاز احمد آذر، یاسمین حبیب، ڈاکٹر کوثر محمود، محمد مسعود احمد، نرجس افروز زیدی، محمد مختار علی، سید نوید حیدر ہاشمی، سیّد اذلان شاہ، حمیرا راحت، گلفام نقوی، شمیم الماس شی، نذیر اے قمر، ارشد محمود ارشد، ضیاء اللہ قریشی، سہیل انجم شہزاد، ساحل سلہری، ابرار ندیم ' ۲۷ تا ۴۴	
مختصر خبریں / تقریبات ' ۴۵	
تبصرۂ کتب ' ۴۷	
نامہ ہائے احباب ' ۵۰	
یادیں ' ۵۲	

زرِ سالانہ مع ڈاک خرچ مبلغ 1000 روپے

بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں

برائے خط و کتابت

نستعلیق پبلی کیشنز

الفیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

0092+423+7351963 / 0300-4489310

email: nastalique786@gmail.com

FAR EAST MARKETING CO.

SAMARIA MANSION 605 KOENJI-MINAMI 1-6-5,
SUGINAMI-KU, TOKYO, 166-0003,JAPAN
E-MAIL: femc1@hotmail.com

عامر حسین پبلشرز نے زاہد بشیر پریس ریٹی گن روڈ سے چھپوا کر اردو بازار لاہور سے شائع کیا۔

نورین طلعت عروبہ/ راولپنڈی
خزاں نصیب رُتوں کو گلاب دیتا ہے — بجھی نظر کو چمکدار خواب دیتا ہے

نورین طلعت عروبہ حمد و نعت کی نہایت معتبر اور مایہ ناز شاعرہ ہیں۔ اُن کے پہلے نعتیہ مجموعے ''حاضری'' کو قومی سیرت ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ وزیراعظم پاکستان نے اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ اُردو میں کسی بھی خاتون شاعرہ کا پہلا نعتیہ مجموعہ ہے۔ اُن کے دوسرے نعتیہ مجموعے ''زہے مقدر'' کو بھی قومی سیرت ایوارڈ سے نوازا گیا جو کہ صدر پاکستان نے پیش کیا۔ سعودی عرب جانے سے قبل 98ء تک وہ پی ٹی وی میں بطور براڈ کاسٹر بھی کام کرتی رہیں اور اب بھی اسکرپٹ رائٹر ہیں۔ ان کے کالج اور یونیورسٹی کے تقریری اور شعری مقابلوں میں جیتے گئے انعامات، ایوارڈز اور اسناد کی تعداد 342 ہے۔ آٹھویں کلاس میں انہوں نے گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔ نورین طلعت عروبہ کی شاعری عقیدت اور سرشاری کا ارفع نمونہ ہے۔

یہ ٹوٹی پھوٹی عبادت قبول کر لینا
ترے لیے ہے عقیدت قبول کر لینا
مجھے پتہ نہیں اظہار کیسے کرنا ہے
تو پھر بھی میری محبت قبول کر لینا
یہ اشک جو مرے آنچل میں جھلملاتے ہیں
انہیں بھی اجر کی بابت قبول کر لینا
ہمارے گریۂ پیہم کی التجا سن لے
جھکی نظر کی ندامت قبول کر لینا
جو میرے واجبی اعمال رد کیے جائیں
نبی کریمؐ کی نسبت قبول کر لینا
ترے ہی اذن سے توفیق نعت گوئی ہے
سو میرے رب مری مدحت قبول کر لینا
جو میرے لفظ ہوں قاصر بیان کرنے سے
مرے خلوص کی شدت قبول کر لینا

برسے جو اشک میرے برسات سے زیادہ
رب نے عطا کیا ہے اوقات سے زیادہ
میں بابِ ملتزم سے لپٹی ہوئی کھڑی ہوں
اب اور بات کیا ہو اس بات سے زیادہ
جذبات ہیں کہ میرے قابو میں ہی نہیں ہیں
اور کہنا چاہتی ہوں جذبات سے زیادہ
ہے نعت درحقیقت اِک حمد ہی کی صورت
معراجِ شعر کیا ہو پھر نعت سے زیادہ
نظرِ کریم میں ہوں، میں جو حطیم میں ہوں
کیا مانگنے کو جاؤں سوغات سے زیادہ
محسوس کر کے دیکھو، شہ رگ کے پاس ہے وہ
کوئی نہیں یقیناً اس ذات سے زیادہ
کیا اور شے جہاں میں اس درجہ قیمتی ہے؟
اس در سے ملنے والی خیرات سے زیادہ

خزاں نصیب رُتوں کو گلاب دیتا ہے
بجھی نظر کو چمک دار خواب دیتا ہے
دھنک کے رنگ سجاتا ہے آسمان پہ وہ
چمکتی دُھوپ میں ابرو سحاب دیتا ہے
شبوں کو چادرِ ظلمت سے ڈھانپنے والا
علی الصبح ہمیں پھر آفتاب دیتا ہے
اگر نصیب رہے، رنگ ہاجرہ بی بیؓ
تو ہر سوال کا فوری جواب دیتا ہے
وہ ماورا ہے جو توصیف سے، ہمارے لیے
حروفِ حمد کو یہ آب و تاب دیتا ہے
اُتارتا ہے وہ قرآن رہنمائی کو!
اور اِک بہ شکل محمدؐ کتاب دیتا ہے
وہ نیتوں سے ارادوں کو جانچنے والا
عمل سے پہلے ہی کیا کیا ثواب دیتا ہے

خوف کیسا مرے مولا کہ نگہبان ہے تو
ہم خطاکار بہت اور مہربان ہے تو
زخم کے ساتھ ہی مرہم بھی عطا کرتا ہے
کیسے کہہ دوں کہ مرے حال سے انجان ہے تو
تجھ میں اے دل جو یہ توحید کی رعنائی ہے
کون کہتا ہے تجھے بے سرو سامان ہے تو
مقتدر تو ہے، مقدم بھی، احد بھی تو ہے
آپ ہی اپنی بڑی شان کے شایان ہے تو
ہم اسے دل میں بساتے ہیں اسے چومتے ہیں
تیری کیا بات ہے خود خالق قرآن ہے تو
تری رحمت کہ کبھی مجھ سے جدا ہوتی نہیں
ساتھ رہتی ہے ترے دم سے کہ رحمٰن ہے تو
ذرّے ذرّے میں نمایاں ہے نشانی تیری
ساری دُنیا کی حکایات کا عنوان ہے تو

ہو جائے بے سکون تو رب کے کرم میں آ
دُنیا کی حد کو چھوڑ، حدودِ حرم میں آ
لبیک کی صدا کبھی دھیمی، کبھی بلند!
صوتی کمال دیکھنے اس زیر و بم میں آ
سود و زیاں کا خوف ہو محشر کے واسطے
ہرگز نہ اس جہاں کے کسی بیش و کم میں آ
پلکوں سے چومنے کی تمنا ہو معتبر!
تصویرِ خانہ کعبہ مری چشمِ نم میں آ
دُنیا کی فکر چھوڑ کے اللہ کو پکار
جو ٹوٹتا نہیں ہے کبھی اس بھرم میں آ
آ کے حروفِ حمد کو انوار بخش دے
صحنِ حرم کی روشنی نوکِ قلم میں آ

ریاض ندیم نیازی / سبی

ریاض ندیم نیازی عصر حاضر کے ایک جواں سال، جواں فکر اور جواں ہمت اہل قلم ہیں جو بلوچستان کے شہر بی جیسے دیارِ سنگ و ریگ میں شعر وسخن کے خوش نما پھول کھلانے کا فریضہ پوری یک سوئی اور خلوص کے ساتھ سرانجام دینے میں مصروف ہیں۔ وہ خوبصورت غزل بھی لکھتے ہیں اور حمد ونعت کی تخلیق کے ذریعے سامانِ شفاعت اور توشہ آخرت کا بندوبست بھی کیے جارہے ہیں۔ ندیم نیازی کی تخلیق کی ہوئی حمد ونعت اس حقیقت کی عکاس ہیں کہ ندیم نیازی کو باعث تخلیق کائنات کی ذاتِ والا صفات سے والہانہ وابستگی ہے اور یہ جذبہ عشق ومودت اخلاص کی اساس پر استوار ہے۔ ندیم نیازی کا کلام سادگی، سلاست، جذبہ شوق کی شدت اور وارفتگی وشیفتگی سے معمور ہے۔ ان کی پیشتر نعتوں میں زمزمہ سرائی کی کیفیت جھلکتی ہے۔ (حسن اکبر کمال)

اُنؐ کی تجلیات ہیں حاصل گلی گلی
آباد ہے حضورؐ کی محفل گلی گلی
گونجی ہوئی ہے نعرۂ حق سے ہر ایک سمت
رُسوا ہوا ہے زمرۂ باطل گلی گلی
ایک اِک جگہ پہ پاؤ گے اُمت رسول کی
پھیلا ہوا ہے جوہر قابل گلی گلی
گھر سے رواں ہوا جو میں تبلیغ کے لیے
پیر و نبیؐ کے ہو گئے شامل گلی گلی
پڑھتے ہیں صرف نعت وہ کچھ مانگتے نہیں
دیکھے ہیں ہم نے ایسے بھی سائل گلی گلی
میلادِ مصطفیٰ میں چراغاں ہے چار سو
عید النبیؐ میں ہوتی ہے جھل مل گلی گلی
اشعارِ مدح ونعت جو میں نے پڑھے ندیم
مجھ پر زمانہ ہو گیا مائل گلی گلی

غرق ہو جائے اگر اُنؐ کی محبت میں کوئی
خود بخود کانوں میں جنت کی ندا آتی ہے
اپنے دامن پہ لگے داغ چھپاؤں کیسے؟
کیسے اُس در پہ چلوں، مجھ کو حیا آتی ہے
دل میں پیہم جو رہے اُسوۂ آقاؐ کا خیال
اس سے انسان میں توفیق وفا آتی ہے
بھاگ جاتی ہے، مرے لب پہ جو آتا ہے درُود
بھول کر بھی مری جانب جو بلا آتی ہے
ہر چٹکتے ہوئے غنچے کو سکھاتی ہے ثنا
صبح دم صحن گلستاں میں صبا آتی ہے
خوشبوئے نعت گلستاں میں لٹاتی ہے بہار
جب یہ پہنے ہوئے پھولوں کی قبا آتی ہے
یہ کوئی اذنِ طلب تو نہیں طیبہ سے ندیم
میرے کانوں میں کوئی بانگِ درا آتی ہے

گرچہ ہے سارے مہینوں سے تعلق میرا
آرزو حج کے مہینے کی طرف جاتی ہے
کس مہینے میں ملے اِذن سفر کا مجھ کو
سوچ ایک ایک مہینے کی طرف جاتی ہے
وہ جو سرکارؐ کے روضے سے ضیاء بار ہوا
چشم حیراں اُسی سینے کی طرف جاتی ہے
اے ندیم اپنی نظر لوٹ کے درباروں سے
اُن کی رحمت کے خزینے کی طرف جاتی ہے

جب مدینے سے کوئی موجِ ہوا آتی ہے
مجھ کو خاموش بلاوے کی صدا آتی ہے
اُنؐ کے در سے مرا آ جائے بلاوا یارب
رات دن میری زباں پر یہ دُعا آتی ہے
شاعری کا مری، حاصل ہے تو بس نعتِ رسولؐ
جب قلم پر مرے آتی ہے ثنا آتی ہے

جب کوئی ناؤ مدینے کی طرف جاتی ہے
موج اُٹھ اُٹھ کے سفینے کی طرف جاتی ہے
یوں تصور میں مرے آتا ہے طیبہ کا جمال
جیسے انگشت نگینے کی طرف جاتی ہے
عشق نے مجھ کو سلیقے سے کیا ہے واقف
اب مری آنکھ قرینے کی طرف جاتی ہے

مجھ کو اے موجِ کرم لے جا مدینے کی طرف
میں نے اب نظریں جما دی ہیں سفینے کی طرف
کون سے ماہِ مبارک میں ملے اِذنِ حرم
سال بھر میری نظر ہے ہر مہینے کی طرف
میں شہ کونینؐ کے بابِ کرم کا ہوں گدا
میری نظریں کب ہیں دُنیا کے خزینے کی طرف
جیسے لگتے ہی نہیں تھے پاؤں دھرتی پر مرے
مکے سے میں جا رہا تھا جب مدینے کی طرف
اِس طرح مائل ہیں طیبہ کی طرف رُوح و بدن
جیسے کوئی بے ہنر جائے قرینے کی طرف
اے ندیم اِک معجزہ ہے وہ شب معراج بھی
جب نبیؐ مائل ہوئے گردوں کے زینے کی طرف

کیا کوئی اور شہزاد احمد بھی ہے؟

عطاء الحق قاسمی

جب کبھی مجھے فون پر برادرِعزیز ناصر بشیر کا میسج آتا ہے۔ میرا دل کسی نامعلوم اندیشے سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اُس کی بھیجی ہوئی کئی خبریں دل اُداس کرنے والی ہوتی ہیں۔ آج سہ پہر کو فون پر میسج کی ٹون سن کر میں نے فون کو آن کیا تو ناصر بشیر کی طرف سے پیغام درج تھا ''شہزاد احمد انتقال کر گئے'' مجھے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ ابھی گزشتہ روز فون پر اُن سے بات ہو رہی تھی۔ مجلس فروغِ اُردو ادب دوحہ قطر کی جیوری کی طرف سے اس بار مجھے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ (حاصل عمر ایوارڈ) کے لیے نامزد کیا گیا ہے جو نومبر کے مہینے میں قطر میں منعقد ہونے والی ایک پاک و ہند تقریب میں دیا جانا ہے۔ مجلس کے مقامی منتظم داؤد ملک نے مجھے بتایا کہ مجلس کے فیصلے کے مطابق شہزاد احمد آپ کے فن اور شخصیت پر مقالہ پڑھیں گے۔ شہزاد احمد کا فون اسی حوالے سے تھا، وہ کہہ رہے تھے ''میرے پاس تمہاری کچھ کتابیں ہیں، فلاں فلاں نہیں ہیں، وہ مجھے بھجوا دو'' اور میں انہیں کہہ رہا تھا کہ بھجوانے کی کون سی بات ہے میں کل خود یہ کتابیں لے کر آپ کے پاس آؤں گا۔ چنانچہ آج مجھے اُن کی طرف جانا تھا، جاؤں گا ضرور کیونکہ اُن سے وعدہ کیا ہوا ہے لیکن اب میرا یہ جانا ان کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے ہے۔ کل من علیہا فان

شہزاد احمد سے میرا تعلق چالیس برس پرانا ہے۔ اُس وقت وہ جوان تھے اور میں نوجوان تھا۔ شاعری میں اعلیٰ مقام اور مرتبے کے باوجود اپنے ملنے والوں کو یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کسی اعلیٰ مسند پر فائز ہیں اور یوں انہیں یہ استحقاق حاصل ہے کہ ان کی یک طرفہ اور غیر مشروط عزت کی جائے۔ بے تکلفی ان کی فطرت کا خاصہ تھی۔ چنانچہ عمر اور مرتبے کے فرق کے باوجود میں انہیں اسی طرح مخاطب کرتا تھا جس طرح کسی بے تکلف دوست کو مخاطب کیا جاتا ہے اور ان کا انداز بھی ویسا ہی تھا۔ یہی رویہ عہدِ حاضر کے بہت بڑے غزل گو ظفر اقبال کا بھی ہے۔ اپنے جون ایلیا، احمد فراز اور خاطر غزنوی بھی ایسے ہی تھے اور کچھ ایسے ہی ''طور اطوار'' بابائے صحافت وقار انبالوی کے بھی تھے۔ دراصل اس طرح کے لوگ کسی قسم کے کمپلیکس میں مبتلا نہیں ہوتے۔ شہزاد بھی کمپلیکس فری تھے، جس محفل میں ہوتے اس میں اپنی خوش بیانی سے جان ڈال دیتے تھے۔ ایک بار ایک سینئر شاعر نے ان سے کہا ''اوئے شہزاد! تم عینک نہ لگایا کرو عینک لگا کر تم بجو لگتے ہو''۔

شہزاد نے اس پر ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا ''میں اگر عینک اُتار دوں تو آپ مجھے بجو لگنے لگتے ہیں۔''

شہزاد پکے امرتسری تھے۔ امرتسری کشمیری کلچر غالب تھا۔ چنانچہ وہ خود کو ''اعزازی کشمیری'' کہتے تھے۔ محفل میں جب کسی اجنبی سے میرا تعارف کراتے تو کہتے ''یہ میرا اُستاد گھرانہ ہے'' اور اس کی وضاحت یوں کرتے ''میں ان کے والد ماجد سے ایم اے او ہائی سکول امرتسر میں پڑھا ہوں اور میری بیٹی کالج آف اکنامکس لاہور میں ان کی اہلیہ کی شاگرد رہی ہے۔'' مشاعروں میں شرکت کے لیے دوسرے شہروں میں جانا ہوتا تو وقت گزاری کے لیے کسی حاضر یا غیر حاضر شاعر دوست کی منظوم ہجو گوئی کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ہم سب اس میں اپنا حصہ ڈالتے۔ تاہم مقدار اور معیار کے حوالے سے شہزاد کا حصہ سب سے زیادہ ہوتا، ایک دو بار ہم نے خود شہزاد پر ان کی موجودگی میں طبع آزمائی شروع کر دی اور انہوں نے اس میں پرجوش حصہ لیتے ہوئے خود اپنی ہجو میں ایسے ایسے شعر کہے جو کہنے کے لیے بڑے ''جگرے کی ضرورت ہوتی ہے'' ایک بار اسی طرح کے ایک سفر میں ایک اجنبی نوجوان بھی ہمارا ہم سفر تھا جو دو افراد والی سیٹ پر شہزاد کے برابر بیٹھا تھا۔ میری نشست شہزاد کے پیچھے تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ شہزاد اس نوجوان کے ساتھ فلسفے کے موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں جو اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ چنانچہ وہ خاصا مرعوب مگر کنفیوژڈ نظر آ رہا تھا۔ جب میں نے صورت حال زیادہ گھمبیر ہوتی دیکھی تو میں نے شہزاد کو کندھے سے ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا ''شہزاد صاحب وہ جو یونان میں سوفسطائی فلسفے ہوئے تھے وہ سادہ لوح لوگوں کو کیسے چکر دیا کرتے تھے؟'' اس پر شہزاد ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے اور یوں اُس نوجوان کی جان چھوٹ گئی۔

اور ہاں یہ تو شہزاد کی شگفتہ شخصیت کی چند جھلکیاں تھیں مگر ان کی شاعری اور ان کا علم؟ بلے بلے بلے جب اُس کی شاعری کی پہلی چہکار سنائی دی، اُسے ایک بالکل منفرد آواز قرار دیا گیا اور پھر ایک پوری نسل ان کے رنگ میں رنگتی چلی گئی اور جہاں تک ان کے علم و فضل کا تعلق ہے میرے خیال میں وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے آگے تھے۔ فلسفہ، سائنس اور نفسیات ان کے خاص موضوعات تھے اور ان موضوعات پر ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ کلاسیکی شعراء میں وہ اقبال کے سب سے زیادہ قائل تھے۔ انہوں نے اقبال کے لیکچرز کا ترجمہ بھی کیا، سائنسی موضوعات پر ان کے وقیع مضامین بھی موجود ہیں اور انہوں نے ان موضوعات کی حامل کتابوں کے تراجم بھی کیے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ علم کی بہتات نے ان کی شاعری کو تھوڑا سا نقصان بھی پہنچایا۔ مگر تھوڑی بہت لینڈ سلائیڈنگ سے کسی پہاڑ میں کون سی کمی واقع ہو جاتی ہے؟

سو ہمارے عہد کا ایک نہایت اہم شاعر اور اسکالر ہم سے جدا ہو گیا ہے۔ وہ ۸۱ برس اس دُنیا میں رہا اور اپنے لفظوں سے معاشرے کو خوبصورت بنانے میں لگا رہا۔ وہ خود بھی تو بہت خوبصورت تھا اور اس خوبصورت شخص کو آج ہم نے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارنا ہے۔ اس کی جدائی کا غم اپنی جگہ لیکن یہ کیا کہ جو جاتا ہے اس کی جگہ لینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ فیض احمد فیض، جون ایلیا، مجید امجد، میراجی، ن م راشد، منیر نیازی، ناصر کاظمی، احمد فراز، شفیق الرحمٰن، محمد حسن عسکری، پطرس بخاری، قرۃ العین حیدر اور دوسرے بہت سے چلے گئے ان کی جگہ کون آیا؟ شہزاد احمد بھی چلا گیا، کیا ہمارے درمیان کوئی اور شہزاد احمد ہے؟

ہیلو ہیلو......ٹرن ٹرن......ٹووں ٹووں

حافظ مظفر محسن

''السلام علیکم'' میں نے پہلی بیل پر موبائل فون آن کیا تو کوئی بولا۔۔۔''وعلیکم السلام'' میں نے جوب دیا تو بے تکلف ہوتے ہوئے فرمانے لگے:

'' لگتا ہے سو رہے تھے ''۔۔مجھے حیرت ہوئی۔۔۔میں نے حیرت کو قابو میں کیا اور عرض کی۔۔حضور آپ کی پہلی بیل پر میں نے موبائل آن کرلیا اور آپ کے سلام کا جواب سانس لیے بغیر دے دیا۔۔۔اچھا ٹھیک ہے آپ جب دل چاہیں سوئیں ۔۔جاگیں۔۔ دوستوں کو کبھی کبھار فون ضرور کر لیا کریں۔

وہ بولے اور فون بند ہو گیا تھا۔۔۔شاید بات کرتے کرتے سو گئے تھے؟! ملتان سے یہ کال تھی۔ جب بھی فون آیا فرماتے ہیں''سو رہے ہو''!

'' ہیلو''۔۔۔'' ہیلو''۔۔۔'' ہیلو''۔۔۔پہلی بیل کے بعد میں نے فون آن کیا تو دوسری طرف سے کسی نے تین بار زور زور سے ہیلو کیا۔۔۔اگر میں کانوں سے بہرہ بھی ہوتا تو کہہ ڈالتا ''میاں آہستہ بولو۔۔۔کان مت کھاؤ''۔۔

''افضل ''۔۔۔''افضل ''۔۔۔''افضل ''۔۔۔پھر تین بار بولے''جی ہاں۔۔۔جی ہاں۔۔جی ہاں۔ میں نے پہچان لیا''۔۔میری اس وضاحت کا نوٹس لیے بغیر پھر گرجے۔۔۔''لگتا ہے کھانا کھا رہے تھے۔۔کھانا۔کھانا''''حضور میں کھانا کھا رہا تھا۔۔۔یا آپ''۔۔۔میں نے وضاحت چاہی تو بولے۔۔۔''گرمیوں میں تیتر بٹیر مت کھانا۔۔۔عقل ماری جاتی ہے''۔۔''آپ نے اب کھانے چھوڑ دیے ہیں یا نہیں؟'' یہ پہلی بات تھی جو انھیں سمجھ آ گئی۔۔جس پر انھوں نے خوشی کا اظہار اس طرح کیا۔۔ہاہا۔۔ہاہا۔۔ہاہا!

یہ افضل صاحب گوجرانوالہ میں رہتے ہیں۔لکھاری ہیں لیکن گھر داری کے لیے مٹھائی کا کام کرتے ہیں۔۔مٹھائی کھانے کا نہیں مٹھائی تیار کرنے کا۔۔تیس سال کے ہیں اور بتانے والی بات یہ کہ اٹھائیس سال سے شوگر کے مرض میں مبتلا ہیں۔کسی کو بتاتے نہیں۔ مبادا۔۔۔کوئی مٹھائی اور دوائی اکٹھی کھانے سے روک دے۔۔۔ویسے آپ کوشش نہ کریں بات کبھی نہیں مانتے۔۔کسی کی بھی نہیں۔۔کہتے ہیں مزاح نگار ہیں۔۔۔مگر میں نے کبھی انھیں ہنستے نہیں دیکھا۔ جنازوں میں شریک نہیں ہوتے کہتے ہیں،ہنسی آ جاتی ہے کہ جب میرا جنازہ اٹھے گا تو بڑے بھائی جان کی شامت آ جائے گی کیونکہ میں نے چالیس پچاس لوگوں سے ادھار لے رکھا ہے اور اگر بھائی جان نے غلطی سے جنازہ اٹھنے سے پہلے پوچھ لیا کہ افضل مزاح نگار نے کسی سے ادھار لیا ہو تو میں حاضر ہوں۔۔۔اور پھر بھائی جان کو لوگ''غائب'' کر دیں گے۔ بھائی جان جانیں۔۔لوگ جانیں۔۔وہ تو فرشتوں سے گفتگو میں محو ہوں گے۔

''ٹرن ٹرن'' ۔۔۔فون بند۔۔۔یہ مس کال تھی۔۔پھر'' ٹرن ٹرن''۔۔پھر فون بند۔۔۔''پھر ٹرن''۔۔پھر مس کال تھی۔۔پھر صرف''ٹر''۔۔پھر کچھ وقفے کے بعد''ٹر''۔۔کیا پریکٹس ہے مس کال دینے کی۔۔ٹرن ٹرن کی بجائے صرف''ٹر''۔۔''ٹر''۔۔یہ آپ غلط فہمی کا شکار نہ ہوں مینڈک کا فون نہیں ہے۔۔۔یہ فیصل آباد سے ہمارے دوست ہیں شیخ اصغر ندیم آپ سمجھ گئے ہوں گے۔۔۔یہ تین ٹیکسٹائل ملز کے مالک ہیں۔۔۔مجھے نہیں یاد کبھی انھوں نے پوری کال کی ہو۔۔۔ہمیشہ مس کال دیتے ہیں اور اگر دومنٹ کے اندر اندر جواب میں آدھ گھنٹے کی کال نہ کروں تو بہت ناراض ہوتے ہیں اور رات وقفے وقفے سے''ٹر'' ۔۔''ٹر'' سے مجھے سونے نہیں دیتے۔۔میں جب کال کرتا ہوں تو سلام دعا نہیں کرتے۔۔سیدھا پوچھتے ہیں''بارش تو نہیں ہو رہی لاہور میں''؟!۔۔کیوں شیخ صاحب۔۔۔''یار بارش ہوگی تو سردی جلد آنے کا اندیشہ ہوگا اور سردی جلد آ گئی تو میری فیکٹری کی بنی لون کون خریدے گا''۔۔! شیخ صاحب چاہتے ہیں بارہ مہینے موسم گرم رہے اور ان کی فیکٹریوں کی بنائی لان سدا بکتی رہے۔۔!پورے خطے کا موسم بدل ڈالنے کا ارادہ ہے موصوف کا۔گرمی ہی گرمی سارا سال گرمی۔

''ٹووں''۔۔''ٹووں''۔۔''ٹووں'' یہ جانی پہچانی کال ہے کراچی سے بھائی نورم خان کی ''ٹووں''۔۔''ٹووں'' میں موبائل آن کرتے ہی بول پڑتا ہوں۔۔ ہاں ہاں بھائی نورم خان۔۔ضرور ضرور اخبار آ گیا ہے۔۔۔مجھے یاد ہے۔۔۔خبریں پڑھنے سے پہلے۔۔۔آپ کا ابھی کالم پڑھتا ہوں۔۔۔ہاں ہاں۔۔۔رائے بھی دوں گا۔۔۔تنقید بھی کروں گا حالانکہ مجھے نہیں یاد میں نے کبھی نورم خان کے کالم پر تنقید کی ہو۔۔۔اک بار کی تھی انھوں نے ایک ایک نکتے پر تنقید کی وجہ پوچھی۔۔تفصیل مانگی اور تقریباً ایک گھنٹہ بات کی کال میری طرف سے تھی۔۔۔!اتنے وقت میں بندہ پورے کا پورا مشتاق احمد یوسفی یا ابن انشا پڑھ لیتا ہے۔

''غررر''۔۔۔''غررر'' یہ عجیب سی بیل ہے لیکن یہ بھی جانی پہچانی ہے۔۔''السلام علیکم۔۔خوب لکھ رہے ہو حافظ صاحب جنھوں نے ایس۔ایم۔ایس پر پابندی لگوائی ہے ان لوگوں نے ان کا نام''حاجی صاحب'' رکھ دیا ہے۔۔سمجھ گئے ہو گے۔۔حالانکہ یہ حاجی صاحب والی

بات انھیں دو دن پہلے میں نے ہی بتائی تھی فون کر کے۔۔۔اور مجھے مرزا شعیب نے۔۔مرزا شعیب کو پتہ نہیں کس نے بتایا ہوگا۔ مرزا شعیب کا صحافت کے شعبے میں خاصا اثر ورسوخ ہے۔۔بس کبھی کبھی ہوتا ہے کہ چھ ماہ پرانی خبر پر بحث چھیڑ لیتے ہیں۔

''یار مظفر۔۔۔وہ کل پھر منی بس میں سفر کر رہا تھا کہ میرا فون گن پوائنٹ پر پھر کسی نے چھین لیا''۔۔۔یہ ہمارے کراچی والے صحافی دوست شوکت علی مظفر ہیں شوکت علی مظفر۔۔۔بھائی گھبراؤ مت۔۔۔مجھے پتہ ہے آپ نے اب کے سات سو روپے کا خریدا تھا۔۔چور بے چارہ ستر روپے میں بیچ پائے گا۔۔۔لاکھ منت سماجت کے بعد۔۔''حاجی صاحب'' کا واسطہ دے کر۔۔۔ میں نے ان کی حوصلہ افزائی کی تو ہنسنے لگے۔۔۔یہ دیکھ اسی لیے تو ہنس رہا ہوں۔اب کے میں نے کال کی۔۔۔ دسویں بیل پر اٹھایا ''اپنا ہیلو''۔۔''اپنا مظفر بھائی بول رہا ہے''۔۔۔''اپنا کی حال اے'' ''پتہ چلا ہے۔۔۔اپنا ۔۔۔خدا بخش خوشاب والے کے ساتھ پھر فراڈ ہو گیا ہے۔۔۔!''ہور سن۔۔۔اپنا ہمارے محلے میں کراچی کی صابری نہاری والوں کی۔۔۔اپنا سنا ہے برانچ کھل رہی ہے''۔۔۔''اپنا سلام علیکم''۔۔

فون میں نے کیا ہے۔۔۔مجھے بولنے نہیں دیا گیا۔۔۔اپنا اپنا۔۔۔میں۔۔میں۔۔اپنی سنائی اور فون بند۔۔۔ اس دوران میں بھی بھول گیا۔۔۔کہ اپنا ۔۔۔میں نے بھائی چوہدری امجد گجر کو کیوں فون کیا تھا''؟! یہ لاہور سے لاہور کی جانے والی کال کا تذکرہ تھا۔

''ٹاں''۔۔۔''ٹاں''۔۔۔''ٹاں''۔۔۔ یہ پشاور سے ملک گلاب خان کی کال تھی۔۔۔''ہیلو۔۔۔یار بھول گیا۔۔کیا کہنا تھا مظفر بھائی۔۔۔وہ کتاب آپ نے پھر نہیں بھیجا۔۔۔'' گلاب خان میں نے برادر بکسٹال والوں کو آرڈر کے مطابق دس کاپیاں بھیجا ہے'''' او ہو۔۔۔تم نے نیو برادر والوں کو بھیجا ہوگا۔۔۔میں خالی برادر پہ چلا گیا تھا۔۔۔ابھی گیا۔۔''۔۔۔''اور ہاں سن وہ طالبان کے خلاف زیادہ نہ لکھا کرو۔۔۔ادھر تمھاری کتابیں بیچنے والوں کی دوکان اڑا دیں گے وہ ظالم بارود سے۔۔۔!''

خوفناک پیغام دیا اور کال بند۔۔۔۔گلاب خان گیا۔

منڈی ڈھاباں سنگھ ایک جگہ ہے وہاں سے ایک کالج کا طالب علم شہر یار بارود گلی والا مجھے اکثر فون کرتا ہے۔۔۔اس کا فون اکثر اس وقت آتا ہے، جب میں کھانا کھا رہا ہوتا ہوں یا ''واش روم'' میں ہوتا ہوں۔۔۔ ''سر جی مجھے شاعری میں اپنا شاگرد بنالیں''۔۔اس بے چارے کو کیا پتہ کہ میں نے خود اخبار میں اشتہار دے رکھا ہے کہ شاعری کی اصلاح کے لیے ایک عدد استادِ محترم کی تلاش ہے''۔۔شہر یار یہ تم نام کے ساتھ بارود والی گلی کیوں لکھتے ہو۔۔۔کہیں یار تمھارا تخلص تو نہیں۔۔۔مجھے یہاں جھانپڑ دشمن آبادی یاد آ گئے ان کی ایک غزل ذرا دیکھیے۔

کیا بتاؤں جب سے وہ مجھ کو ملی چکر میں ہے
پہلی تو چکر میں تھی اب دوسری چکر میں ہے
روبرو ہے وہ مرے اور گھورتی ہے وہ مجھے
اب غزل میں کیا سناؤں، کھوپڑی چکر میں ہے
اس کے باوانے لگا رکھے ہیں پہرے رات دن
دل لگی دل کی لگی جب سے ہوئی چکر میں ہے
ایک دھوبن سے مری جب سے ملاقاتیں ہوئیں
دیکھ کر کپڑے نئے بیگم مری چکر میں ہے
تو بھی جھانپڑ آ گیا چکر میں چکر کی قسم
قریہ قریہ شاعراں ہیں، شاعری چکر میں ہے

ایک فون کوئٹہ سے میرے بھانجے علی کا آتا ہے۔۔نہ سلام نہ دعا......''ماموں......آپ حج پر کب جا رہے ہیں، میرے لیے وہاں سے آب زم زم بہت سا لیتے آنا۔۔یہ جو ابلا پانی مجھے ماما پلاتی ہیں۔۔۔یہ کڑوا لگتا ہے۔۔۔خدا حافظ''۔۔

اس کال کا مطلب ومفہوم کیا ہے۔۔اللہ ہی جانتا ہے۔۔۔

ایسی باتیں سمجھنے سے بہتر ہے بندہ بس خوش ہو لے۔۔۔جیسا کہ۔۔۔''ایک صاحب پینٹر کو گھر لائے اور شام کو دفتر سے گھر آئے تو پینٹر نے اپنی مہارت سے پینٹ کر کے گھر کی حالت ہی بدل ڈالی تھی۔۔۔وہ صاحب خوش ہوئے اور طے شدہ اجرت کے علاوہ سو روپے انعام دیے اور دیتے ہوئے کہا ''آج رات بیگم کے سات فلم دیکھنے چلے جانا'' پینٹر دعائیں دیتا چلا گیا۔۔

رات کو گھر کے باہر کسی نے دستک دی۔۔۔ ان صاحب نے دروازہ کھولا۔۔ سامنے پینٹر کھڑا تھا۔۔''کیا بات ہے، کوئی چیز بھول گئے ہو'' ان صاحب نے پوچھا۔۔۔

''جی نہیں'' پینٹر نے جواب دیا ''میں تو بیگم صاحبہ کو سینما لے جانے کے لیے آیا ہوں''۔۔۔

موبائل فون غلط فہمیاں پیدا کرتا ہے، ضرورت بھی پوری کرتا ہے، بڑے بڑے مشکل مرحلوں میں کام بھی آتا ہے۔نیند کی خرابی کا باعث بنتا ہے، اچھے اچھے میسج پڑھنے کو دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ گوجرانوالہ سے فون آئے گا تو بات کھانوں کی ہوگی۔کھابوں کی ہوگی نان کی ہوگی، کبابوں کی ہوگی، پیٹ کی بیماریوں یعنی نت نئے عذاب کی ہوگی، ملتان سے فون آئے گا۔۔نیند کی بات ہوگی سونے کا ذکر ہوگا اور گرمی کے تذکرے ہوں گے، لاہور سے فون آئے گا، فراڈ کا ذکر ہوگا۔۔ چوری ڈاکہ کی خبر ہوگی اور لمبی بات ہوگی۔۔بے مقصد۔۔گویا ہر شہر ہر قصبے کے اپنے اپنے رسم و رواج طور اطوار ہیں ۔ یہی حال مختلف ممالک کا ہے۔۔۔ہم پاکستان میں بیٹھ کر انگلینڈ، امریکہ، جرمنی، فرانس کے بارے میں کچھ خواب دیکھتے ہیں۔۔۔وہاں جا کر پتہ چلتا ہے کہ واقعی یہ سب خواب ہی تھا۔

شاعری وہ جو نیکی کے ساتھ دلچسپی اور برائی کے ساتھ نفرت دلائے

نوجوان نسل کی گرفت لفظ پر ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ لفظ کا فنکارانہ استعمال نہیں ہو رہا

ادب کی ترویج کے لیے قائم اداروں سے مجھے ذاتی طور پر کوئی شکایت نہیں

جس ماحول میں ادیب رہتا ہے اُس کی سیاسیات اور سماجیات سے متاثر ہونا لازمی امر ہے/ انور مسعود

نامور شاعر انور مسعود سے عامر بن علی کا خصوصی انٹرویو

ارژنگ: ذریعہ اظہار شاعری کیوں منتخب کیا؟ لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

انور مسعود: بات یہ ہے کہ میں جس گھر میں پیدا ہوا وہاں شاعری کا ماحول موجود تھا۔ میری نانی اماں شاعرہ تھیں اور تایا بھی شاعر تھے۔ جس شہر میں پرورش پا رہا تھا وہاں بھی شاعری کا بہت دور دورہ تھا۔ شاعری میں مجھے شروع سے ہی دلچسپی تھی۔ آپ دیکھیں کہ میں فارسی کی شاعری پڑھتا تھا حالانکہ مجھے فارسی کی بالکل سمجھ نہیں تھی۔ میری والدہ کو لٹریچر سے بہت دلچسپی تھی۔ والد صاحب نے بچپن میں ہی مجھے حفیظ جالندھری کا ''شاہنامہ اسلام'' لا کر دیا۔ اب بھی اُس کے کئی شعر مجھے زبانی یاد ہیں۔ یہ وہ ماحول تھا جس میں شوق پروان چڑھا اور لکھنے کا خیال آیا۔ یہاں میں اپنے شفیق اساتذہ چوہدری فضل حسین اور سید حامد حسین کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ انہوں نے بھی اس بابت بہت رہنمائی فرمائی۔

ارژنگ: آپ پیدا کہاں ہوئے؟ بچپن کہاں گزرا؟ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے گا؟

انور مسعود: پیدائش تو میری سوہنی مہیوال کے چناب والے گجرات میں ہوئی۔ مگر والد صاحب کاروبار کے سلسلے میں لاہور ہجرت کر گئے۔ پرائمری سکول یعنی پانچویں جماعت تک کی تعلیم میں نے لاہور میں حاصل کی۔ بعدازاں والد صاحب واپس گجرات آ گئے اور ہم لوگ بھی ان کے ساتھ۔ میٹرک میں نے پبلک ہائی سکول گجرات سے فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پاس کیا۔ F.S.C میں زمیندار کالج میں داخلہ لیا۔ والدین مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے مگر میری طبیعت شاید ڈاکٹری کے لیے موزوں نہیں تھی۔ جب لیبارٹری میں لڑکے مینڈک وغیرہ کی Disection کر رہے ہوتے تو میں غزل لکھ رہا ہوتا تھا۔

ارژنگ: تعلیمی سلسلہ پھر آگے کیسے بڑھا؟

انور مسعود: آرٹس کی تعلیم کی طرف آ گیا تھا۔ ایف اے میں میں نے سکالرشپ حاصل کیا۔ بی اے میں سلور میڈل لیا اور زمیندار کالج گجرات سے گریجوایشن کے بعد میں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ یہ سکول کنجاہ میں تھا۔ میری مشہور نظم ''ماں'' گجرات کے قریبی علاقے کنجاہ میں تدریسی زمانے کی یادگار ہے۔ یہ وہاں ہی لکھی گئی تھی۔ دو سال پڑھانے کے بعد میں لاہور آ گیا۔ اورینٹل کالج میں M.A میں داخلہ حاصل کیا اور ایم اے میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ میری پنجاب میں پہلی پوزیشن تھی۔ اس کے بعد میں نے گورنمنٹ سروس جوائن کر لی۔

ارژنگ: آپ فارسی کے پروفیسر بھی رہے۔ تدریسی زمانہ کیسا گزرا؟ فارسی سے آپ کے خاص لگاؤ کی وجہ کیا ہے؟

انور مسعود: فارسی تو ہمارے گھر کی روایت بھی ہے۔ یوں کہ میری بیوی بھی فارسی پڑھاتی تھی، میں نے بھی فارسی پڑھائی اور اب میری بیٹی بھی کالج میں فارسی پڑھا رہی ہے۔ تدریسی زندگی بڑی بھرپور رہی۔ کئی شہروں میں پڑھایا، ڈیرہ غازی خان، بہاولنگر، پنڈی گھیپ، گجر خان، راول پنڈی، مری میں بھی پڑھاتا رہا۔ اسی دوران ۱۹۷۶ء میں چالیس اساتذہ کے وفد کے ہمراہ چار مہینے کے لیے ایران کے سرکاری دورے پر گیا۔ مجھے اس وفد کی سربراہی کرنے کا موقع بھی ملا۔

ارژنگ: آپ نے اپنی بیگم اور بیٹی کا تذکرہ کیا۔ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں گے؟

انور مسعود: میرے تین بیٹے اور دو بچیاں ہیں۔ سب شادی شدہ ہیں۔ ایک بیٹا لاہور میں عمار مسعود دنیا ٹی وی میں ملازم ہے، جس نے پی ٹی وی کا مقبول پروگرام ''رات گئے'' شروع کیا تھا۔ اُس نے ایک نابینا لڑکی سے شادی کی تھی اب تو وہ بے چاری فوت ہو گئی ہے۔ باقی چاروں بچے یہاں اسلام آباد میں ہی رہتے ہیں۔

ارژنگ: ادب کی ترویج و ترقی کے لیے قائم اداروں کی کارکردگی سے آپ مطمئن ہیں؟

انور مسعود: کارکردگی ٹھیک ہی ہے۔ اپنی سطح پر وہ کوشش کر رہے ہیں۔ بعض لوگوں کو شکایات بھی ہیں۔ ہر چیز سے ہر کوئی تو مطمئن نہیں ہو سکتا۔ مجھے ذاتی طور پر تو کوئی شکایت نہیں ہے۔ میری پہلی کتاب ''میلہ اکھیاں دا'' پر مجھے پاکستان رائٹر گلڈ کی طرف سے انعام ملا۔ پھر اکادمی ادبیات نے مجھے میری کتاب ''ہن کیہہ کریے؟'' پر ایوارڈ دیا۔ مجھے صدارتی ایوارڈ بھی ملا ہے۔ میری نظر میں تو یہ ادارے اپنا کام دستیاب وسائل میں بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ سب کو مطمئن کرنا تو ممکن بھی نہیں ہے۔

ارژنگ: کیا ادیب کا سیاست میں بھی کوئی کردار ہونا چاہیے؟

انور مسعود: ادیب جس ماحول میں رہتا ہے اُس سے جدا نہیں ہو سکتا۔ سماجیات اور سیاست سے الگ ہونا ممکن ہی نہیں اور نہ ہی یہ مستحسن عمل ہے۔ کیا علامہ اقبالؒ نے مسلم لیگ میں حصہ نہیں لیا تھا؟ کیا قائداعظم کے ساتھ اُن کا مکمل تعاون نہیں تھا؟ علامہ اقبال نے تو نہ صرف مقامی سیاست میں حصہ لیا بلکہ عالمی سیاست پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ اقوامِ متحدہ کی والدہ لیگ آف نیشنز کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ کفن چوروں کا ٹولہ ہے جس ماحول میں ادیب رہتا ہے اس کی سماجیات و سیاسیات سے متاثر ہونا لازمی امر ہے۔ میرے

خیال میں شاعری وہ جو نیکی کے ساتھ دلچسپی پیدا کرے اور برائی کے ساتھ نفرت دلائے۔ یہ فرض تو میں اپنی حد تک ادا کرتا رہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔

ارژنگ: آپ نہیں سمجھتے کہ جب سے پرائیویٹ ٹی وی چینلز کا چرچا ہوا ہے ادبی سرگرمیوں کی کوریج دب سی گئی ہے؟

انور مسعود: میں تائید کرتا ہوں آپ کے خیال کی۔ ادبی کارروائیاں ہمارے ٹی وی چینل پر کم ہوگئی ہیں۔ کمرشلزم ٹی وی پر چھایا ہوا ہے۔ اب تو بس جب محرم آتا ہے تو ایک سلام کا مشاعرہ ہو جاتا ہے یا پھر عید میلاد النبیؐ پر نعتیہ مشاعرہ کر دیا جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں ادب کی ترویج تھی اب نہیں ہے۔ ہاں اخبارات میں ادب کے متعلق مواد مل جاتا ہے۔ جو اس کمی کو کسی حد تک پورا کر دیتا ہے۔

ارژنگ: قومی اخبار کے ادارتی صفحہ پر روزانہ آپ کا قطعہ چھپتا ہے۔ کبھی صحافت بھی کی ہے؟ کالم نگاری کے بارے میں کبھی نہیں سوچا؟

انور مسعود: یہ سوال اکثر مجھ سے پوچھا جاتا ہے۔ کئی شعرا کرام اچھے کالم نگار بھی ہیں۔ ان میں امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی بہت اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں اور انتہائی اچھے کالم نگار بھی ہیں۔ مگر میری طبیعت کچھ کالم نگاری کی طرف نہیں آئی۔ میں نے ایک دفعہ ایک جگہ لکھا تھا کہ میرے قطعہ کو ہی میرا کالم سمجھ لیجیے۔

ارژنگ: نوجوان ادیبوں کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

انور مسعود: ان کو پیغام صرف یہ ہے کہ شعر و ادب لفظوں کا کھیل ہے۔ جب تک لفظ سے آگاہی نہ ہو تب تک معیاری شعر و ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ لفظوں میں پائی جانے والی موسیقیت اور معنویت کے ادراک کے بغیر لفظ کا مناسب استعمال نہیں آ سکتا۔ نوجوان نسل کی گرفت لفظ پر ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ لفظ کا فنکارانہ استعمال نہیں ہو رہا ہے۔ نوجوان ادیبوں کو چاہیے کہ وہ سینئرز کو خوب پڑھیں میر تقی میر، مرزا غالب، فیض احمد فیض، مجید امجد سمیت تمام سینئرز ادیبوں کا بھرپور مطالعہ کریں۔

یوں بلندی پہ کبھی بخت کا تارا جائے
اُن کی محفل میں مرا نام پکارا جائے

وقت کا کیا ہے کسی طور گزر جائے گا
کتنا اچھا ہے اگر مل کے گزارا جائے

ساتھ بس اتنا مرے آپ کو چلنا ہوگا
ساتھ دریا کے یہ جتنا بھی کنارا جائے

گو زمیں زاد سہی کچھ تو کشش ہے مجھ میں
جس طرف چل دوں اُدھر چاند، ستارا جائے

اپنی ہستی کو فنا کر کے تجھے پیار کیا
کیسے ممکن ہے تجھے دل سے اُتارا جائے

زندگی ایک امانت ہے اُسے پیار کرو
زندگی کھیل نہیں ہے کہ جو ہارا جائے

جس نے اِک عمر یونہی کاٹ لی تاریکی میں
اُس پہ اقرار کوئی نور کا دھارا جائے

(اقرار مصطفیٰ)

آنکھیں غزل ہیں آپ کی

(انتخابِ غزل)

مرتب: ریاض ندیم نیازی

ملنے کا پتہ:

رنگ ادب پبلی کیشنز اُردو بازار، کراچی

دل کا چین مدینہ

(انتخابِ نعت)

مرتب: ریاض ندیم نیازی

ملنے کا پتہ:

رنگ ادب پبلی کیشنز اُردو بازار، کراچی

رُقعاتِ مشفق خواجہ

بنام

ڈاکٹر سلیم اختر: ڈاکٹر طاہر تونسوی

☆ یہ مکاتیب نہیں، تحریر کا آئینہ ہے جس میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں سے قاری پوری طرح متعارف ہوتا ہے۔
☆ ادب کی چاشنی، نئی تراکیب وضع کرنے کی صلاحیت کی مثالیں ان مکاتیب میں ملتی ہیں۔
☆ ڈاکٹر خالد ندیم نے نہایت عرق ریزی سے حواشی کے ساتھ اس مجموعہ کو مرتب کیا ہے۔

قیمت -/250 روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی اسٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

متفرق شاعری

گیت لکھیں اور کالے کاغذ لے کر ناچیں گھومیں
روشنیوں کے شہر میں ان کی چاروں اور ہیں دھومیں
بھونرے کس ہرجائی پن سے باغ میں پھیرے ڈالیں
پروانے کس پاگل پن سے گال گلوں کے چومیں
ان کے نیزوں بھالوں سے ہے جان کو خطرہ لاحق
جانے کیسے حملہ آور آئے میرے لہو میں
نور کی ہجرت شہر دعا تک ہو کے رہتی تھی ایسے
فجر کی رحمت وارد ہوگئی شام کے "اللہ ہو" میں
اس مشروب کا ایک ہی قطرہ موت کو دعوت دے گا
کس نے کہا تھا بغض دریا کا ڈالو زہر سبو میں
سر کے اُوپر سات فلک اُمید و بیم ہے قائم
میرے گرد و پیش میں غم کے ساتھ سمندر گھومیں
ایک ہی سکہ اشک ندامت اُس نے ڈالا گویا
ساری دنیا میں نے ثاقب بھر لی ظرفِ کدو میں

آصف ثاقب

دستِ شفا

بادل آیا ہے کس رُوپ کا بہروپ بھرے
پھول لے آئے دہکتی خوشبو
تتلیاں رنگ کا چھڑکاؤ کیے جاتی ہیں
چوٹیاں تن کے کھڑی...... حسن بھری دھرتی پر
آسماں ڈوبتے سورج نے شفق رنگ کیا
وادیاں سبز ڈھلانوں میں سمٹ بیٹھی ہیں
ہونٹ چھوتی ہی چلی جاتی ہے بے باک ہوا
گال خوشبو سے بھرے دیتی ہے نم ناک ہوا

رُوپ جتنے بھی بھرے رنگ بدلتا بادل
نقرئی جسم ترا کیسے بنے!
پھول کیسی ہی مہک لے آئیں
ہائے وہ تیرے بدن کی خوشبو
ناچتی، مست بناتی خوشبو
من کے اندر سے کہیں اُٹھتی ہوئی!
تتلیاں رنگ چھڑک سکتی ہیں
ہائے وہ رنگِ نظر سوز کہاں
تیرے پیراہن صد رنگ سے جو چھنتا ہے
چوٹیاں جتنی تنی ہوں، ترے جوبن سی نہیں
وادیاں کچھ بھی سہی، تیرے نشیبوں سی نہیں
کیسے ممکن ہے کہ وہ رنگ شفق میں آئے
جو ترے رُخ پہ ترے تن کی تپش سے آئے
ہونٹ چھوتے ہیں تو چھوتے چلے جائیں جھونکے!
تیرے ہونٹوں، ترے گالوں کا کوئی لمس نہیں!
حسن ماحول اُداسی کو بڑھا دیتا ہے!
لاکھ قدرت کے نظارے ہوں مگر تنہائی
آنکھ سے آنکھ ملاتا ہوا منظر مانگے
لاکھ نظروں میں کھِلے رنگِ شبابِ فطرت
دیدۂ ہجر تو انسان کا پیکر مانگے

شہزاد نیرّ

مری اُونچ نیچ آشنا نہیں ہو سکی
وہ حسیں ڈگر مرا راستہ نہیں ہو سکی
لب و حرف سے مرا اعتبار ہی اُٹھ گیا
ترے بعد مجھ سے کوئی دعا نہیں ہو سکی
مرا اشک چشمہ چشم میں کہیں گھل گیا
کوئی روشنی تھی، مگر دِیا نہیں ہو سکی
ترا عکس دل میں جڑا رہا سو پڑا رہا
تری شکل پہ آنکھ پہ آئینہ نہیں ہو سکی
وہ عجیب رنگ کی بے کلی مجھے دے گیا
اسے دل سے دور بہت کیا، نہیں ہو سکی
مرے ہونٹ پر گل گفتگو نہیں کھل رہا
یہ بہار بھی مرا ماجرا نہیں ہو سکی
دلِ شاعراں میں وہ پھانس بن کے چبھی رہی
کوئی واردات جو واقعہ نہیں ہو سکی

شہزاد نیرّ

دل ہی ادا کرے تو کرے دل کے واجبات
آنکھوں سے طے نہ ہوں گے دلوں کے معاملات
محرومیوں نے دل کی تمنائیں چھین لیں
بچوں نے کرنے چھوڑ دیے ہیں مطالبات
گو زندگی گزار رہے ہیں سبھی مگر
حاصل کسی کسی کو ہیں اس کے لوازمات
لوگوں نے اپنی ذات سے منسوب کر لیے
میں نے رقم کیے تھے فقط اپنے واقعات
بارِ غم حیات وہی کا وہی رہا
ہم نے گھٹا کے دیکھ لیں اپنی ضروریات
آنکھوں کے راستے کبھی محمود بن کے آ
مدت سے منتظر ہے مرے دل کا سومنات
لوگو! تمہارے حسن مروّت کو کیا ہوا؟
میزانِ زر میں تول رہے ہو تعلقات

انجام ایک سا ہے وہ نصرت ہو یا کہ میر
ذرّے کو ہے ثبات نہ خورشید کو ثبات

نصرت صدیقی/نصر صدیقی

دل عجب کچھ غیریت کے سلسلوں سے گزرا ہے
ہر شناسا شخص مجھ سے فاصلوں سے گزرا ہے
کہف کے اصحاب کی صورت پھروں حیراں سا
شہر میرا ارتقا کے مرحلوں سے گزرا ہے
کم ہی آئے ہیں نظر خوشیوں کے منظر آنکھ کو
آدمی غم کے زیادہ جنگلوں سے گزرا ہے
کوئے جاناں میں نمی عشاق کے اشکوں سے تھی
ایسے لگتا ہے کوئی ان بادلوں سے گزرا ہے
عظمتِ منزل بتائے دے رہی ہے اے سحاب
راہ رو یہ کیسے کیسے حوصلوں سے گزرا ہے

اسلم سحاب ہاشمی/ساہیوال

ترا لہجہ بھی نشتر ہو گیا ہے
بچھڑنا اب مقدر ہو گیا ہے
یہ کس کی یاد مہکی ہے فضا میں
کہ سارا گھر معطر ہو گیا ہے
فراق و وصل کے لمحوں کا نگراں
تری یادوں کا لشکر ہو گیا ہے
جو اندر آنکھ کے ٹپکا تھا جاناں
وہ آنسو اب سمندر ہو گیا ہے
منافق تھا بہت، سو اس لیے وہ
مرے حلقے سے باہر ہو گیا ہے
سر دربار سچ بولے گا کیسے
جو وقفِ منصب و زر ہو گیا ہے
کوئی بھی شے ٹھکانے پر نہیں اب
یہ کیسا گھر کا منظر ہو گیا ہے
یہ کس کی آنکھ سے آنسو گرے ہیں
کہ سنگِ در منور ہو گیا ہے
جو چاہا تھا وہ ارشد ہو نہ پایا
جو نہ چاہا وہ اکثر ہو گیا ہے

ارشد ملک/راولپنڈی

ترے نام کی تھی جو روشنی اُسے خود ہی تو نے بجھا دیا
نہ جلا سکی جسے دھوپ بھی اُسے چاندنی نے جلا دیا
میں ہوں گردشوں میں گھرا ہوا مجھے آپ اپنی خبر نہیں
وہ جو شخص تھا میرا رہنما اُسے راستوں میں گنوا دیا
جسے تو نے سمجھا رقیب تھا اسے ہاتھ سے ہی مٹا دیا
مجھے عشق ہے کہ جنون ہے ابھی فیصلہ ہی نہ ہو سکا
مرا نام زینتِ دشت تھا مجھے آندھیوں نے مٹا دیا
یہ اُداسیوں کا جمال ہے کہ ہمارا اوجِ کمال ہے
کبھی ذات سے بھی چھپا لیا کبھی شہر بھر کو بتا دیا
مری عمر کا ابھی گلستاں تو کھلا ہوا ہے ضرور پر
وہ جو پھول تھے تری چاہ کے انہیں موسموں نے گرا دیا

ارشد ملک/راولپنڈی

اِک ذرا بات میں جادو وہ چلا دیتا ہے
جیسے پت جھڑ میں کوئی پھول کھلا دیتا ہے
اس کے ہونٹوں کا فقط ایک تبسم جیسے
بزمِ تاریک میں اِک شمع جلا دیتا ہے
تیری یادوں کا ہر اِک لمحہ دلِ ویراں کو
اِک نئی روشنی دیتا ہے جلا دیتا ہے
اس کی آنکھوں میں گوارہ نہ کروں میں آنسو
جو سدا درد مجھے دے کے رُلا دیتا ہے
میرے جذبات کو اِک جھوٹی تسلی دے کر
مری معصوم وفا کا وہ صلہ دیتا ہے
عمر بھر کی رفاقت کو وہ بھلا کیسے سمجھے؟
چند لمحوں میں جو رشتوں کو بھلا دیتا ہے
یہ مہکتا ہوا احساس تری قربت کا
میری ہستی کے گلابوں کو کھلا دیتا ہے

نسیم سکینہ صدف

دریادِ حضرت پرنم الٰہ آبادیؒ

چھان مارا ہے کل جہاں پرنم
آپ کو ڈھونڈیں ہم کہاں پرنم
جگمگاتا تھا آسمانِ ادب
آپ سے تھی یہ کہکشاں پرنم
غنچہ و گل نثار ہوتے تھے
آپ تھے جانِ گلستاں پرنم
سائے کی طرح ساتھ رکھا تھا
کون ایسا ہے مہرباں پرنم
میں نے سیکھا ہے آپ سے جینا
میرا دل اور میری جاں پرنم
یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے
آپ تھے میر کارواں پرنم
آپ کی یاد میں ہے پرنم آنکھ
یہ عقیدت کی ہے زباں پرنم

اقبال پیام شجاع آبادی

بچہ، باپ اور بیڈروم

دستگیر شہزاد

گھر میں داخل ہوتے وقت گل فراز کا ذہن ان کاغذات میں اُلجھا ہوا تھا جنھیں وہ دفتر لے جانا بھول گیا تھا۔ بیٹھک کے بعد برآمدے کی گیلری سے گزرتے ہوئے اسے ٹھٹک جانا پڑا۔ گل فراز کا شیر خوار بچہ علی اپنی آیا لاڈو کی گود میں لیٹا تھا۔ دودھ کی آدھی سے کم خالی شیشی زمین پر دھری تھی اور علی لاڈو کے پستان میں منہ لگائے آرام سے چسر چسر کر رہا تھا۔ زمین پر پالتی مار کر بیٹھی لاڈو لوری دیتی آہستہ آہستہ ہل رہی تھی اور اپنے آپ میں اتنا مگن تھی کہ اسے گل فراز کی آمد کا پتہ بھی نہیں چل سکا۔ گل فراز کو معلوم تھا کہ لاڈو غیر شادی شدہ ہے اور اس کی بیوی گلنار نے بچے کی دیکھ بھال کے لیے رکھا تھا تا کہ وہ ٹینشن فری ہو کر آرام سے دفتر کے کام کر سکے۔ گل فراز نے لاڈو کو سرسری طور پر تو کبھی غور سے بار ہا دیکھا تھا مگر گھٹیلے بدن والی کالی کلوٹی لڑکی میں دور یا پاس سے دیکھنے والی کوئی چیز کبھی نظر نہیں آئی۔ اس نے تو گلنار پر خاصہ زور دیا تھا کہ کوئی دوسری نوکرانی رکھ لی جائے۔

''نجانے کیوں وہ مجھے گندی لگتی ہے...... اس کا لُک......''

''میں اسے نئے کپڑے خرید دوں گی'' گلنار اپنے فیصلہ پر اٹل تھی۔ ''بہت دُکھی ہے بیچاری۔ یتیم ہے۔''

گلنار کے آگے گل فراز کی ایک نہ چلی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ گلنار نے لاڈو کا انتخاب کرتے وقت اس کی بدصورتی، کالے کلوٹے پن اور گل فراز کی ناپسندیدگی کو بطور خاص مدنظر رکھا تھا۔ اپنے شوہر کے تحفظ کے خیال سے ایک بیوی کے لیے ایسا کچھ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ حالانکہ سیکس کے معاملہ میں گل فراز صابر و شاکر قسم کا انسان تھا اور عورت کے لیے اس میں بہت زیادہ تھرسٹ نہیں تھی۔ یہ بات گلنار نے شادی سے پہلے گل فراز کو ایک دوست کے رُوپ میں دیکھ کر پرکھ لی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لاڈو کو دیکھتے ہوئے گل فراز کی ہمیشہ سکڑی رہنے والی ناک بھوں گلنار کے اطمینان کے لیے کافی تھی۔ مگر اس وقت گل فراز ششدر رہ گیا جب آبنوسی انار کی چمک نے اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔ وہ بت بنا لاڈو کو دیکھتا رہ گیا۔

لاڈو والہانہ انداز میں بچے کو چوم چوم کر لوری دے رہی تھی۔ پنجابی زبان کے نغمے اور اس کے ہلنے میں عجیب سا آہنگ تھا۔ فوری طور پر گل فراز کا جی چاہا کہ وہ خود بھی آنکھ بند کر لے اور دفتر وفتر سب کچھ بھول جائے۔ ننھا علی دودھ میں منہ لگائے لوری سن رہا تھا۔ کبھی کبھی آنکھ کھول کر لاڈو کو دیکھتا اور پھر بند کر لیتا۔ اس کا ایک ہاتھ لاڈو کے سینے کے پاس دبا ہوا تھا مگر دوسرا ہاتھ آزاد تھا جس سے وہ کبھی لاڈو کے گال چھوتا تو کبھی ننھی منی اُنگلیوں سے اس کے ہونٹ نوچنے لگتا۔ وہ لمحہ بھی عجیب تھا جب لاڈو نے گل فراز کی موجودگی کا نوٹس لیا اور اس حالت میں اسے سامنے پا کر سٹپٹا گئی۔ گھبرائی ہوئی لاڈو جلدی سے کھڑی ہو گئی اور بوکھلاہٹ میں اپنا سینہ بھی ڈھانکنا بھول گئی۔ ''آپ صاحب جی آپ......''

''اپنا دودھ کیوں پلا رہی ہو؟'' گل فراز نے آہستہ سے کہا۔ ''علی شیشی نہیں پیتا کیا؟''

''نہیں صاحب جی...... شیشی پیتا ہے۔''

''تو پھر؟'' گل فراز مسکرایا۔ ''ابھی تو تمہاری شادی بھی نہیں''

''بات یہ ہے...... صاحب جی'' لاڈو نے ایک ہاتھ پر بچے کو سنبھال کر اپنا سینہ ڈھکتے ہوئے کہا۔

''شیشی پینے کے بعد یہ بہت روتا ہے...... اور جب تک اسے ماں کی طرح...... نوچتا ہے...... بہت ضد کرتا ہے۔''

لاڈو اس لمحہ کو بھلا کیسے فراموش کر سکتی تھی جب علی بری طرح رو رہا تھا اور وہ اسے بہلانے کی ہر کوشش کر کے ناکام ہو چکی تھی۔ تب اُس کے ذہن میں نجانے کہاں سے یہ خیال آ گیا کہ اگر روتے ہوئے بچے کو سینے سے لگا لیا جائے تو شاید چپ ہو سکتا ہے۔ جب وہ ایسا سوچ رہی تھی تب علی بھی اپنے ننھے سے ہاتھ کی نرم اُنگلیوں سے اس کا سینہ نوچ رہا تھا اور گریبان کھسوٹ رہا تھا۔

''اچھا تو...... تم...... یہ شریر......'' گل فراز کے چہرے پر شوخی عود کر آئی اور علی کے گال پر ہلکی سی تھپکی دینے کے بہانے لاڈو کے سینے کی سختی کو اچھی طرح اُنگلیوں سے محسوس کر کے کہا ''ایسے...... ایسے چپ ہوتا ہے یہ۔''

''ہاں...... ہاں صاحب جی'' گل فراز کی اُنگلیوں کا لمس پا کر سمٹی ہوئی لاڈو نے علی کو ہاتھ کے سوپ پر لٹا کر چوم لیا۔ اسے وہ لمحہ یاد آ گیا جب بلکتے ہوئے معصوم بچے نے اس کا پستان اپنے نرم گرم ہونٹوں سے دبا کر چٹ چٹ کر آواز نکالی تھی اور انجان لذتوں کے احساس سے اس کا پورا وجود پگھل اُٹھا تھا۔ اس کے بعد علی جب بھی لاڈو کے دودھ کو اپنے ہونٹوں میں دباتا تو پورے بدن میں ترنگوں بھری گدگدی دوڑنے لگتی۔ وہ علی کو سینہ سے بے ساختہ بھینچ لیتی اور چاہتی کہ اس کے وجود کو قطرہ قطرہ پی کر یہ بچہ بڑا سا گھبرو جوان بن جائے۔ ایسے میں وہ رب سے دعا مانگتی کہ اس معصوم بچے کی خاطر اپنی رحمت کے سمندر اس کے خالی کٹوروں میں انڈیل دے تا کہ ڈبہ والے دودھ کی بوتل کو کوڑے میں بہا سکے۔ علی کو اس طرح بہلاتے ہوئے وہ خاصی احتیاط سے کام لیتی تھی کہ مبادا اس کی چوری نہ پکڑی جائے۔ مگر آج گل فراز نے اسے رنگے ہاتھوں دبوچ ہی لیا۔

''تم تو بڑی ہوشیار نکلیں'' گل فراز نے لاڈو کو پھر چھیڑا اور وہ شرما کر سمٹ گئی۔ اس بار گل فراز کی اُنگلیوں نے اس کے گالوں کو چھوا تھا اور بہانہ وہی تھا یعنی لاڈو کو تھپکنے کا۔ اتنی دیر میں لاڈو بھانپ چکی تھی کہ علی کی طرح اس کا باپ بھی تشنگی اور محرومی کے احساس سے گرفتہ ہے اور اب دھیرے دھیرے اس جگہ پہنچ گیا ہے جہاں بھوک، چٹورپن اور ندیدگی میں کچھ امتیاز نہیں رہ جاتا۔ لاڈو کا خیال سو فیصد صحیح تھا۔ کیونکہ علی کی پیدائش کے مختصر سے وقفے کے بعد گلنار نے اسے اپنا دودھ پلانا بند کر دیا تھا۔ اسے اپنے بدن کے زاویوں اور فگر کا خیال زیادہ تھا...... علی کا کم۔ انھیں دنوں جب گلنار کے ملبب پستانوں سے بار بار گل فراز کا منہ خراب ہوا تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ بیوی نام کی جس عورت کے ساتھ وہ سوتا ہے اس کے پاس سینہ جیسی کوئی چیز نہیں۔ شدید جھنجھلاہٹ سے گزرتے ہوئے ایسے میں وہ حصولِ منزل کے لیے اپنے

آپ کو خود ملتجی سمجھتا اور گلنار کے بغیر ہی سفر شروع کر دیتا۔ گلنار اس کی بے چینی اور بستر کی ہلت ذلت کا احساس کرنے کے بعد بھی سونے کی اداکاری کرتی رہتی۔ ناآسودگی کی اس کیفیت سے گل فراز بہت دنوں تک دوچار رہا۔ یہی وجہ تھی آج اپنے بچے کی سیدھی سچی اور بھولی ماں کے بطور اُسے دیکھ کر گل فراز کے دل میں محبت کا جوالہ مکھی پھٹ پڑا اور کالی کلوٹی گنوار لاڈو اسے دنیا کی حسین ترین عورت معلوم ہونے لگی۔

''صاحب جی...... آپ...... آپ کھڑے کیوں ہیں؟'' لاڈو کی آواز گل فراز کو اپنے دماغ میں چلتی ہوئی آندھی میں حرف حرف بہتی ہوئی محسوس ہوئی اور لڑکھڑاتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش میں اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

''بیٹے کی چیز پر باپ کا بھی حق بنتا ہے۔'' پھر اس کا پورا بدن اینٹھنے لگا۔ ساری رگیں تن کر چٹخنے کے قریب تھیں۔

لاڈو زور سے ہنس پڑی اور بولی ''باپ کو چاہیے کہ وہ بیٹے کی طرح مانگے۔ صاحب جی...... اگر مانگنے والے کو ڈھنگ سے مانگنا آ جائے تو دینے والا اسے مانگنے سے پہلے ہی دینے کے لیے بے چین ہوتا ہے اور پھر آپ نے وہ کہاوت تو سنی ہوگی...... جب تک بھوکا بچہ روتا نہیں......اسے''

گل فراز تیز قدموں سے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کے قدم دھوئیں میں پڑ رہے تھے۔ گل فراز کے جانے کے بعد علی کسمسانے لگا تو لاڈو نے اسے کندھے سے لگا لیا۔ دل سے صاحب جی کا ڈر نکلنے کے بعد اس کے چہرے پر بلا کا اعتماد چھلک اُٹھا۔ اب لوری گنگناتے وقت اس کی آواز میں لرزہ نہیں تھا۔ وہ اپنے صاحب جی کے بدلے ہوئے رویے پر حیران تھی کہ جو شخص اس کی طرف دیکھنا تک گوارا نہ کرتا تھا وہ......

پستان کے پاس جہاں اُس نے گل فراز کی اُنگلیوں کا دباؤ محسوس کیا تھا وہاں عجیب سی چبھن چھٹ پٹا رہی تھی جو علی کے نچلے مسوڑھے سے جھانکنے والے دو سفید موتیوں کی لچک سے کچھ خاص مختلف نہیں تھی۔ تھوڑی دیر میں علی گہری گہری سانسیں بھرنے لگا تبھی پاس سے کسی روتے ہوئے بچہ کی آواز سن کر لاڈو چونک پڑی۔ علی گہری نیند میں گم ہو گیا تھا اور بچہ رونے کی آواز گل فراز کے بیڈ روم سے آ رہی تھی۔

معروف شاعر خاور نعیم بٹ کے شعری مجموعے و شعری انتخاب

جہاں جاؤں جدھر جاؤں مجھے سب تیرا کہتے ہیں
خوشی سے میں نہ مر جاؤں مجھے سب تیرا کہتے ہیں

جب تم پاس ہوتے ہو (شعری مجموعہ)

اپنا خیال رکھنا (انتخاب)

مجھے اپنا بنا لو تم (انتخاب)

تم میرے ہو (انتخاب)

ترے دل میں رہنا ہے (انتخاب)

مجھے سب تیرا کہتے ہیں (انتخاب)

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

غبار آنکھوں سے لے کر پرشکستہ بھی
صبا کے سائے میں پلتی ہے ریگِ صحرا بھی

لہو کا زائچہ لکھنے سے پہلے سوچتی ہوں
ہوا کیوں خشک مری آرزو کا دریا بھی

بھٹکتی پھرتی ہوں دشتِ جنوں میں آٹھ پہر
چلی ہوں کھوجنے جینے کا کچھ بہانہ بھی

خموشیوں کی سفارت نے کر دیے پرزے
گلوں کو دیکھا بہاروں میں آب دیدہ بھی

میں اپنے زخموں کی پرسش کروں تو کیسے کروں
دریدہ پیرہن اُتری ہے عمر رفتہ بھی

میری انا کا جنازہ اُٹھا کے سوچتے ہیں
فسادِ جان کو کرنا ہے پارہ پارہ بھی

درونِ خانہ ہوتی ہیں یہ سازشیں کیا کیا
گلوں نے کہہ دی ہے بلبل سے ساری بپتا بھی

ایم زیڈ کنول/لاہور

انقلابی چہرے

شاعر: محمد حسین یاور

ناشر: نستعلیق مطبوعات، لاہور

وطن کی مٹی عظیم ہے تو

(ملی نغموں کا انتخاب)

مرتب: شکیلہ ستارہ

ناشر: نستعلیق مطبوعات، لاہور

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک

ثمینہ سیّد/ لاہور

''دادو آپ کو کچھ چاہیے تو بتائیں میں کالج جا رہی تھی سوچا پوچھ لوں۔''

دِیا نے حیات خاں کے کمرے میں جھانکا تو وہ بمشکل ہلے اور مسکرا کے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر منہ میں کچھ پڑھنے لگے تو وہ چپ چاپ کھڑی ان کو دیکھتی رہی۔ جب انہوں نے دیا کی طرف پڑھ کر پھونک دیا تو وہ مسکراتی ہوئی سرشاری سی چلی گئی۔ وہ ایسی ہی تھی معصوم سی سرخ وسفید دیا نصیر احمد حیات خان کی پوتی ایم فل کی طالبہ تھی۔ حیات خان کی دوسری نسل سات بہنیں اور ساتوں ذہین فطین، خوبصورت۔ حیات خاں دیا کو سوچتے ہوئے زیرلب مسکرائے جا رہے تھے۔ تبھی باہر سے آتی آوازیں انہیں متوجہ کرنے لگیں۔ کوئی زور زور سے چلا رہا تھا۔ حیات خان اُٹھے ادھر ادھر ہاتھ مار کر اپنی چھڑی ڈھونڈی اور تھکے تھکے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اعصاب تو اعصاب کان اور آنکھیں بھی ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ بہت غور کرتے تو بات سمجھ آتی اور کبھی کبھی تو پھر بھی سمجھ نہ آتی تو آنکھیں بھر آتیں۔ بے بسی کی انتہاؤں میں گھرے وہ چپ چاپ پچھتاوؤں میں گھر جاتے بے آواز روتے رہتے۔ حیات خان کی تین بہنیں تھیں ایک تو ان کی جڑواں بھی تھی جس میں ان کی جان اٹکی رہتی تھی۔ دوسری دونوں سے بھی بے حد پیار کرتے تھے مگر کیا ہوا۔ اس پیار کا وہ جب جب سوچتے آنکھیں لہو رنے لگتیں۔ وہ دروازے میں آ کر کھڑے ہو گئے اور باہر دیکھنے لگے۔ ان کی پوتیاں، بیٹیاں، بہوئیں اور دس بارہ عورتیں گھر میں تھیں۔ سب دِیا سے بڑی عبا پر چلا رہی تھیں۔ وہ اب گھر آئی تھی نشے میں دھت صوفے پر بے سدھ پڑی تھی۔ حیات خان کو کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا بس ساری بات۔ ساری اذیت ناک بات سمجھ آ گئی تو واپس اندر پلٹ آئے ''کیا کروں گا جا کر کس کو کیا سمجھاؤں؟'' وہ زمین پر بیٹھ کر رونے لگے۔ حیات خان کی چار بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا نصیر احمد خان۔ دو بیٹیوں کی شادیاں کر سکے تھے۔ بہت کوشش کی لیکن ان کی بیٹیاں بہت خودسر تھیں۔ انہیں اپنے معیار کا کوئی لگتا ہی نہ تھا۔ عالی شان سے ''حیات ولاز'' سے دنیا بہت ہی چھوٹی اور حقیر سے نظر آتی تھی۔ کچھ ہی سالوں بعد ایک طلاق لے کر اور دوسری بیوہ ہو کر دو بیٹیوں کے ساتھ واپس حیات ولاز آ گئیں۔ تبھی حیات خان کو اچنبھا ہوا تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے وقت کو اُلٹا چلتے دیکھ رہے تھے اور پھر بے بس سے بے بس ہوتے چلے گئے۔ جب نصیر احمد کا ایک ہی بیٹا ہوا اور سات بیٹیاں ہو گئیں مگر دوسرا بیٹا نہ ہو سکا تو حیات خان نے بیٹے کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ''بس نصیر احمد اب اور بیٹیاں پیدا نہ کر۔ میرے بچے ہماری اتنی سزا ہی بہت ہے۔ کئی نسلوں تک یہ سزا ہی کافی ہے'' حیات خان دیا کی پیدائش پہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پھر تو یہ آنسو تواتر سے جاری رہتے کبھی مصلے پر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر تو کبھی نیند کے انتظار میں کئی کئی راتیں جاگنے کے بعد صبر کے بند ٹوٹ جاتے تو وہ روتے چلے جاتے۔ دراصل بیٹیاں تکلیف کا باعث نہ تھیں۔ تکلیف کا باعث تو وہ یادیں تھیں جو پرانی ہوتی ہی نا تھیں۔

''دادو بڑی پھپھو ایران جا رہی ہیں'' دِیا ان کے گھٹنوں کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور روز کی طرح شروع ہو گئی۔ انہوں نے چونک کر دیکھا مگر چپ رہے ''دادو زینب پھپھو اور ان کی بیٹی اسلام آباد گئی ہیں اور آپ کو پتا ہے عکاشہ کا وہاں فیشن شو ہے۔ دادو انٹرنیشنل فیشن شو ہے وہ بہت مشہور ماڈل ہے۔ آپ کبھی تو اس کو دیکھیں وہ ماڈلنگ کرتی ہوئی اتنی پیاری لگتی ہے۔''

حیات خان نے پہلو بدلا۔ انہیں یاد کے ناگ پھر ڈسنے کو سر اُٹھانے لگے۔ وہ دِیا کو کیا بتاتے وہ اس درد پر خوشیاں نہیں منا سکتے بھنگڑے نہیں ڈال سکتے۔'' دادو سیفی بھائی نے امریکہ میں شادی کر لی ہے۔ ہندو لڑکی سے۔''

''دادو زینا کو فلم میں کام مل گیا ہے۔ لوگ اس کی اتنی تعریفیں کرتے ہیں۔ دادو اتنی تعریفیں کہ بس۔ کچھ مت پوچھیں سب کہتے ہیں اس کی شکل ریشماں پھپھو سے ملتی ہے اس لیے اسے اتنی جلدی شہرت ملی۔ دادو جی ایک بات تو بتائیں آپ نے پھپھو کو اداکاری کی اجازت کیسے دے دی تھی'' دیا حسب عادت بولتی جاتی اور معصوم سی بے رحمی سے حیات خان کے زخموں سے کھرنڈ اُتار دیتی۔ ان کی آنکھیں بھیگنے لگتیں تو دیا فوراً سنبھل گئی ''میں چائے لاؤں؟''

''ہاں'' وہ دھیرے سے بولے۔

ان کی بیٹی ریشماں ماضی کی معروف اداکارہ تھی۔ انہوں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ نجانے کیسے اور کہاں رہتی تھی۔ حیات خان کو کچھ خبر نہ ہو سکی کہ وہ کس طرح کی زندگی گزار رہی ہے مگر ایک دن انہیں اس کی موت کی خبر ملی تھی اس کی لاش کے ساتھ۔ تب بھی انہوں نے خاموشی سے بس آسمان کی طرف دیکھا تھا۔

''کاش یہ پیدا ہوتے ہی مر جاتی'' ان کی آنکھوں میں یہ شکوہ شدت سے در آیا تھا اور اب ان کی بیٹیاں اور پوتیاں فیشن ڈیزائنر، ماڈلز، اداکارائیں این جی اوز کی مالکان، پڑھی لکھی خواتین ہونے کے باوجود بدقسمت اور نامراد تھیں۔ سارا زمانہ ان کے گھر کو حیرت سے دیکھتا کہ ان کے گھرانے میں کتنا پیسہ ہے۔ کس قدر صلاحیتیں ہیں مگر عزت اور قسمت دونوں جیسے کوسوں دور رہ گئیں اور اب ادھر کا راستہ ہی بھول گئی ہیں۔

''کبھی تو میری بچیوں کے بخت جاگیں گے۔''

حیات خان نے حیرت سے سوچا اور ٹھنڈی آہ سینے کی جکڑن سے آزاد کی۔

گھر میں کہرام مچا تھا''نجانے آج کیا ہوا؟'' حیات خان کا پورا وجود فرطِ غم سے لرز رہا تھا۔ اُٹھ کر باہر آنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ تبھی روتی چلاتی دیا چلی آئی تو وہ اور شدت سے کانپنے لگے۔ انہوں نے دیا کو کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ حسبِ عادت اُن کے قریب آ بیٹھی۔

''ہما نے اپنے کرسچین کولیگ سے شادی کر لی ہے اور دادو جی بابا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے بہت شدید۔'' دیا بہن کی شادی کا بتا کر اور بابا جان کے ہارٹ اٹیک کا ذکر کر کے شدت سے رونے لگ گئی۔ وہ بھی رونے لگے۔ آج تو دیا کو پیار دے سکے نہ تسلی۔

''میرے مولا! مجھے معاف کر دے، رحم کر، رحم کر، رحم کر مجھ پر کہ تو بلاشبہ قہار ہے، غفار بھی تو ہے۔ مولا بس ختم کر دے میری سزا، میرے اکلوتے بیٹے کو زندگی بخش دے'' حیات خان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ دیا کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

''دادو آپ تو جیسے کسی آہ کے اثر میں ہیں۔'' وہ روتے روتے بولی۔

''وہ کس کی آہ ہے دادو جو ہماری نسل کو کھا گئی۔ کون سا جرم ہے دادو جس کی سزا اس قدر تکلیف دہ ہے۔ دادو مجھے تو بتائیں ہم کس کی بددعا کے حصار میں ہیں۔''

دیا پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بول رہی تھی اور وہ سر جھکائے نہایت ندامت زدہ بیٹھے تھے تسبیح اُٹھا کر یاحی یا قیوم برحمت استغیث کا ورد کرنے لگے۔ تو دیا بھی ہاتھ اُٹھا کر اپنے بابا جان کی خیریت کی دعا کرنے لگی۔

نجانے رات کو کون سا پہر تھا جب نصیر احمد کی لاش گھر میں آئی تو ایک قیامت برپا ہو گئی۔ کیسی قیامت تھی کہ حیات خان اپنے اکلوتے بیٹے اپنے واحد سرپرست کا پرسہ لے رہے تھے اور زندہ تھے۔ انہیں پورا یقین ہو گیا کہ ان کے لیے مغفرت کے سبھی در مقفل ہو چکے ہیں۔

''نجانے موت کب آئے گی کہ یہ سزا اسی طور ہی ختم ہو جائے۔'' وہ بے حال سے بستر پر پڑے تھے۔ نیم جان اور غم و آلام کی اتھاؤں میں گھرے ہوئے تھے۔ تبھی دیا چلی آئی۔ ان کے کمرے میں صرف دیا ہی آئی تھی۔ ٹرے میں چائے اور ناشتہ لیے وہ ان کے پیروں کے پاس آ بیٹھی۔

''اٹھیں دادو جی'' وہ دلار سے بولی۔ جانتی تھی اس وقت وہ درد کی کس حد پر ہیں۔ سانس سزا کی صورت سینے میں گرج برس رہی ہے۔ تبھی اس نے سنا دادو کہہ رہے تھے۔

''دیا ہم چار بہن بھائی تھے۔ میں اور میری تین بہنیں۔ ابا جان دلی میں کلکٹر تھے مگر بہت ایماندار افسر۔ کبھی بھی رشوت نہ لیتے۔ ان کا ایمان تھا کہ اولاد کو حرام کا ایک نوالہ بھی نہیں کھلانا تاکہ ان کی اولاد نیک اور فرمانبردار ہو۔''

حیات خان سانس لینے کو رُکے تو دیا ان کے سر کی طرف آ بیٹھی اور آہستہ آہستہ سر دبانے لگی۔

''ہماری زندگی بہت خوشحال تھی۔ رونقیں ہی رونقیں، خوشیاں ہی خوشیاں اور قہقہے جیسے ہمارے آنگن کی مٹی سے پھوٹتے تھے۔ انہی دنوں ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ ملازمتیں، سکول، کالج سب کچھ اس طوفان کی لپیٹ میں آ رہا تھا۔ دیا تب میں نے صرف ایف اے کیا تھا اور میری بہنیں۔ ایک دسویں میں تھی، ایک آٹھویں میں اور تیسری پانچویں میں۔ ساری فضا اس کہرام سے تہس نہس ہو رہی تھی۔ عزتیں محفوظ تھیں نہ زندگیاں۔''

حیات خان درد سے کراہے اور ذرا سا پہلو بدلا تو دیا ذرا زور سے دبانے لگی۔ وہ پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولے:

''دیا! گھر اُجڑ گئے۔ لٹ پٹ کر لوگ ایک دوسرے کو نوچ رہے تھے۔ تبھی ایک رات ماں بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گئی۔ ہم تو جیسے برباد ہو گئے۔ میں اور ابا تین لڑکیوں کو چھپانے، بچانے میں ہلکان ہو رہے تھے۔ ہاتھ کو ہاتھ کھا رہا تھا۔ سالہا سال سے گھروں سے گھر جڑے تھے اب ان میں دراڑیں پڑ گئیں۔ وہ جو سب آپس میں مامے، چاچے، خالو بھانجے بھتیجے تھے وہ سب ہندو، سکھ، عیسائی اور مسلمان بن گئے۔ دیا میری جان! خون کی ہولی جاری تھی۔ روز سینکڑوں لوگ قافلوں کی صورت ہندوستان سے اس نوزائیدہ مملکت میں آ رہے تھے اور اِدھر سے اُدھر جا رہے تھے۔ اس بھاگم بھاگ میں ایک دوسرے کے مال و اسباب لوٹ رہے تھے۔ عزتیں تک محفوظ نہ تھیں۔ ایسے ہی ایک قافلے میں ہم بھی تھے۔ میں، میری بہنیں اور میرے ابا جان۔''

حیات خان پھر درد کی شدت سے کراہے اور ذرا سے اُونچے ہو بیٹھے۔ جھکے ہوئے کندھے پچھلے ایک ہفتے میں اور جھک گئے تھے۔

''دیا! ہم ایک عذاب میں مبتلا تھے۔ میری بچی، ایک ناقابل بیان اذیت میں تھے ہم۔ اس وقت میں رات بھر جاگ کر بہنوں کی حفاظت کرتا دن میں کچھ پل سو جاتا تو بابا ان کی حفاظت کرتے۔ پھر بھی روز کئی گندی نظروں سے اُلجھنا پڑا تو کبھی کسی کے گندے غلیظ پنجوں سے بمشکل بہنوں کو بچا پاتا۔ تھک گیا تھا میں اور ابا تو جیسے ہمت ہی ہار گئے اور پھر ہمارے پاس پیسہ، زیور، راشن سب ختم ہو گیا۔ ہم لوگ ایک بہت بڑے کنوئیں کی اوٹ میں لڑکیوں کو سلا کر خود جاگتے تھے اور پھر......''

وہ کچھ پل ساکت ہو گئے۔ آنکھیں پھٹنے لگیں۔ دیا نے محبت سے اُن کے ہاتھ دبائے اور چوم لیے تو وہ سسک پڑے۔

''مجھے میری بہنوں سے بہت پیار تھا۔ میں نے خود کو ان کے بغیر کبھی نہیں سوچا تھا مگر......'' وہ کھانسنے لگے۔ آنسو تواتر سے بہتے جا رہے تھے۔

''نجانے رات کو کون سا پہر تھا جب میں نے کنوئیں کے اندر جھانکا۔ وہ بہت گہرا تھا۔ بے حد گہرا۔''

حیات خان نے جھرجھری سی لی۔ دیا کا پورا وجود سرد ہونے لگے۔ اس نے دادو کے ہاتھ چھوڑ دیے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

''میں نے بہنوں کو اُٹھایا اور کہا آؤ باتیں کرتے ہیں'' وہ اُٹھ بیٹھیں۔ میں ان سے باتیں کرتا جاتا اور کنوئیں میں جھانکتا جاتا، ویران خشک کنوئیں میں سانپ اور بچھو شوکتے پھرتے تھے۔ بہت بہت زیادہ گہرائی سے آوازیں آ رہی تھیں۔ تب میں نے آنکھیں میچ لیں اور بہنوں کو کنوئیں میں دھکا دے دیا۔ تیسرے نمبر والی نے مجھے حیرت، محبت اور پھر

نفرت سے دیکھا تھا۔ ہاں دیا دو کو تو پتا بھی نہ چلا کہ میں ایسے کر سکتا ہوں۔ ان کو اپنے خون کو، اپنی لاڈلیوں کو نیچے ہزاروں فٹ گہرے کنویں میں پھینک سکتا ہوں۔''

وہ رو رہے تھے اور دیا شدت سے کانپ رہی تھی۔ انہوں نے اسے بازو کے حصار میں لے لیا اور پہلی بار اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''ابا اور میں پاکستان آ گئے۔ ہمیں بڑے عہدے مل گئے۔ زمین جائیداد بھی ہم نے دھوکے سے ہتھیا لیا۔ ہمارے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نواب فیملی میں میں نے شادی کر لی اور پھر......'' پھر وقت اُلٹنا چلنے لگا۔ ایک خوشی کے ساتھ دو چار غم لپٹے چلے آتے۔ ہماری عزت، وقار اور اقدار کچھ بھی تو خالص نہ رہا۔ ابا کی اور میری آنکھوں نے بیٹیاں ہی بیٹیاں اور ان کے مقدروں سے لپٹی ہماری سزا کی ہر حد دیکھ لی ہے۔ دیا میرا اللہ غفور و رحیم ہے مجھے معاف فرما دے۔ میری جان آسانی سے نکال دے تو اس کا کرم ہوگا مجھ پر۔''

''دادو! ہمیں آپ کی بہت ضرورت ہے۔ دروازہ کھول کر عبا، دعا، زینیا ان کی نواسیاں اور حیات خان کی غم سے نڈھال بیٹیاں ان کے پاس آ بیٹھیں۔ تو وہ مسکرا دیے۔

''میرا اللہ! مجھے معاف فرما دے اور تم لوگوں کے بخت بلند فرمائے۔ بس اب تو یہی دعا ہے۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کرنے لگے۔'' دادو بھائی بھی امریکہ سے آ رہے ہیں۔ رات کو انہوں نے بابا جانی کی وفات پر بہت رو رو کر افسوس کیا اور آنے کا بھی بتایا۔'' دیا سے بڑی عبا نے بتایا۔

''ابا جان سیفی کے چار بیٹے ہیں، اس نے یہ بھی بتایا ہے'' حیات خان کی بہو خوشی سے چلا کر بتا رہی تھی تو جیسے رگوں میں لہو کی روانی پھر سے بڑھنے لگی۔

''شاید میری مغفرت ہو جائے'' انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر سیدھے ہو بیٹھے۔

''ابا جان! سیفی تو ماشاء اللہ بہت ذمہ دار ثابت ہوا کہہ رہا تھا میرے گھر اور میری ماں بہنوں کو میری ضرورت ہے۔ اس لیے واپس آ رہا ہوں۔''

حیات خان سیدھے ہو کر لیٹ گئے اور مشکور سی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ کہہ رہا تھا ''میرے دادو بہت اکیلے ہو گئے ہوں گے۔ میں آ رہا ہوں آپ لوگوں کے پاس ہمیشہ کے لیے۔''

حیات خان کے آنسو روانی سے بہنے لگے۔

''میرے مولا! میری مغفرت فرما۔ میرے گناہ بخش دے۔ میں نے اپنی خطاؤں کی بہت کڑی سزا پالی ہے۔ بس پاک پروردگار! میری اگلی نسلوں کو اس سے محفوظ فرما۔ میری بیٹیوں کے نصیب اچھے کر۔ میں ہار گیا ہوں۔ اپنے غرور اور تکبر کی وجہ سے میں نے بہت سزا پائی ہے۔''

''بہو میری وصیت ہے کہ میری پوتیوں، نواسیوں کو ذات پات کی بھینٹ نہ چڑھانا۔ بس اچھے گھرانے دیکھ کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جانا۔'' وہ بہو سے کہنے لگے۔

حیات خان نے تکیے کے سہارے نیم دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔ وہ بہت تھک چکے تھے۔ اب مکمل آرام چاہتے تھے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس اثر سے چھٹکارہ۔ معافی کی طلب آنکھوں میں لیے آسمان کی طرف دیکھنے لگے کہ شاید آہ کا اثر ختم ہو جائے۔

شاید اُن کی بہنیں اُنہیں معاف کر دیں۔

''میں بہت مجبور تھا'' انہوں نے بہنوں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ بند آنکھوں کے پیچھے وہ تینوں مسکراتی ہوئی آ گئی تھیں۔ بازو کھولے اپنے پیارے بھائی کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔

حیات خان کے رگ و پے میں سکون اُترنے لگا۔ انہوں نے مسکرا کر ہاتھ پاؤں سیدھے کر لیے۔

کلامِ تازہ

ناصر علی/لاہور

دریا کو جیسے سوکھتے پانی کا رنج ہے
ایسے مجھے بھی اپنی جوانی کا رنج ہے

بادل کی شکل، روتے ہوئے آسماں کا دُکھ
کچھ بھی نہیں اسے رہِ فانی کا رنج ہے

یونہی نہیں ہے نخل بدن آنسوؤں سے تر
اس کی جڑوں میں رات کی رانی کا رنج ہے

جاتے ہیں اُس کی دید کی خواہش لیے ہوئے
لمحوں کی تیز تیز روانی کا رنج ہے

دل میں ہر ایک یاد الگ سے ہے سوگوار
دوں کیا وضاحتیں کہ فلانی کا رنج ہے

تازہ ترین دن کی مسرت کے ساتھ ساتھ
دل میں کسی کی یاد پرانی کا رنج ہے

ہر شے کو اپنے اپنے زمان و مکان میں
درپیش روز نقل مکانی کا رنج ہے

ناصر علی قریب کی قبروں کی مار دیکھ
ہمسائیگی میں قربِ میانی کا رنج ہے

بیت بازی

(کلاسیکل شعراء کے مقبول عام اشعار)

مرتب: شکیلہ ستارہ

قیمت: -/200 روپے

ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، لاہور

نامور شاعر ناصر علی کا

دوسرا شعری مجموعہ

''اور''

مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

اجنبی کی ڈائری سے

شہزاد ملک

18 جون میری سالگرہ کا دن، آج بھی اپنے ساتھ ہر سال کی طرح اُداسیاں لیے ہوئے تھا۔ مگر اس دل کے موسم کے ساتھ ساتھ باہر کے موسم میں بھی عجیب سی بے چینی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے آج سورج اور زمین کا ملن ہوگا۔ ہوائیں جیسے رُوٹھی ہوئی بچپن کی اِک سہیلی ہو۔ گرمی اپنا جوبن دکھا رہی تھی۔

18 جون کو مجھے زندگی سب سے زیادہ حسین لگی اور 18 جون کو ہی زندگی مجھے بد سے بدتر محسوس ہو رہی تھی۔ اسی دن خوشیوں کی اِک کلی دل میں کھلی اور اسی دن ہزاروں گلے شکوے چھوڑے مرجھا گئی۔

یادوں کے دریا سے کچھ حسین یادوں کا سیلاب آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت میں بہنے لگا تھا۔ لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے میرا جسم پسینے کے کنویں میں ڈوبا ہوا تھا۔ دماغ میں موجود یادوں والے سینما کی وال اسکرین پر یادوں کی اِک فلم سی چلنے لگی۔ اس فلم کے بیک گراؤنڈ میوزک کی جگہ بہت سی آوازیں آہوں میں گڈمڈ ہونے کی وجہ سے ایسی ہو گئی تھیں جیسے جیٹ طیارہ گزر جانے کے بعد اِک آواز رہ جاتی ہے۔ بھاری خوفناک آواز۔

ایسی ہی آواز دماغ کی شریانوں سے گزرنے لگی تو ایسا لگا جیسے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔ میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ چکر سے آنے لگے اور غنودگی طاری ہونے لگی۔ شاید کچھ دیر پہلے لی ہوئی سلیپنگ پلز کا اثر ہونے لگا تھا اور میں نیند کی وادی میں اِک تھکے ہوئے پرندے کی مانند بوڑھے اُجڑے ہوئے سنسان درخت کی شاخ پہ ہولے ہولے سے اُترنے لگا تھا۔

جب ہلکی ہلکی سی آنکھ کھلی تو شام کے سائے آنچل اوڑھے سورج کے آگے آنے لگے اور پرندے اپنی میٹھی میٹھی زبانوں میں گیت گاتے ہوئے شام کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

جسم بھاری بھاری سا محسوس ہونے لگا تھا۔ آنکھوں کو مسلتے ہوئے واش روم میں گھس گیا۔ نہانے کے بعد میں خود کو کافی فریش محسوس کر رہا تھا۔

عصر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ مسجد گیا اور نماز ادا کرنے کے بعد پاس ہی موجود ہوٹل میں گیا۔ ہلکی بھوک کا احساس ہوٹل جاتے ہی بڑھ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد میں باغِ جناح کی جانب چل دیا۔ جہاں میں اپنا برتھ ڈے ہر سال مناتا ہوں۔ باغ جناح اس روز مجھے یادوں کے جراسک پارک کی طرح لگتا تھا۔ میں اس یادوں کے پارک میں بھٹک سا جاتا ہوں اور یادوں کے خوفناک جانور اچانک کہیں سے آ جاتے اور میں کچھ پل کے لیے سہم سا جاتا تھا۔ اکثر ہی ایسا ہوتا تھا کہ میں یادوں کے جراسک پارک میں یادوں والی ندی کی تلاش میں نکل پڑتا تھا۔ مگر اچانک پرانی یاد کا ایک ڈائنا سور میرے سامنے آ جاتا تھا اور طنز کے زہریلے دانت دکھا کر غراتا۔

میں ڈر گیا اور میں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ مگر یہ کیا؟؟ میں یادوں کے جراسک پارک میں نہیں باغِ جناح میں ہوں۔ مگر تب باغ جناح کے درختوں سے مجھے خوف آتا اور میں گھر کی طرف چل دیا کرتا تھا۔

مگر آج یادوں کے جراسک پارک میں اُس ڈائنا سور کا نام و نشاں بھی نہیں تھا۔ میں اپنی یادوں میں کھویا ہوا تھا کہ قریب سے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ میں تو باغِ جناح میں ہمیشہ ایسے ہی گھنے درختوں اور ویرانی والی جگہ پہ بیٹھتا ہوں اور بہت ہی کم لوگ اس طرف آتے ہیں مگر یہ آواز......

سسکیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے آواز غور سے سنی۔ ارد گرد دیکھا مگر کوئی دکھائی نہ دیا۔ میں آواز کے تعاقب میں اِک بوڑھے درخت تک آیا۔ ہلکی سی سسکیوں کی آواز بہت ہی پاس سے آئی۔ اِک لڑکی کالے سوٹ میں، سرخ آنکھیں اور گالوں پہ آنسوؤں کے ساتھ بہتا ہوا کاجل لے کر آئی اور گریہ نے تو اُس کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔

مجھے دیکھ کے اچانک وہ گھبرا گئی اور خود کو نارمل ظاہر کرنے لگی۔ اُس کے ہاتھ میں ڈائری اور قلم تھا۔ ڈائری شاید وہ مکمل لکھ چکی تھی۔

''گھبرائیے مت! رونے کی آواز سنی تو میں اس طرف چلا آیا۔ شاید مجھے یہ سوال کرنے کا کوئی حق نہیں مگر انسانیت کے ناتے پوچھ رہا ہوں۔ آپ یہاں اور ایسے کیوں رو رہی ہیں؟''

''رونے کی کوئی ایک وجہ ہو تو آپ کو بتاؤں اور اب آپ یہ کہو گے کہ دل کی بات شیئر کرنے سے دل کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ تو یہ لیں میری ڈائری۔ میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے۔''

اُس نے ڈائری میرے ہاتھوں میں پکڑا دی اور بیگ سے منرل واٹر کی بوتل نکالی۔ پانی پیا اور الوداعی نظر مجھ پر ڈالتی ہوئی چلی گئی۔

میری آنکھیں حیرت کی نظر سے اُس کا پیچھا کرتی رہیں۔ اُس کی آواز میرے کانوں میں گونجی:

''میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے۔''

ڈائری لکھنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور میں پاگل سگریٹ پی پی کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر دل کے بوجھ میں اتنا ہی اضافہ ہوا۔ شام کے سائے چاروں طرف پھیل رہے تھے اور میں اس اجنبی کی ڈائری لیے گھر کی طرف چل دیا تھا۔

کیا مجھے ڈائری کو پڑھنا چاہیے۔ نہیں یہ غلط ہوگا کسی کے ذاتی معاملات میں انٹرفیئر ہونا...... لیکن یہ ڈائری تو خود اُس نے مجھے دی ہے۔ کیا ایسا کرنے سے سچ میں اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گا ہوں۔ روتی آنکھیں کیا آنکھیں تھیں وہ۔ کیوں تھا اُن آنکھوں میں اتنا غم...... کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ ڈائری کھولی۔ ماشاءاللہ ہینڈ رائیٹنگ بہت ہی نفیس اور پیاری تھی۔ بالکل اسی کی طرح۔ پہلے صفحہ پر یہ تعارف لکھا تھا۔

السلام علیکم!

میرا نام ریحانہ خان ہے۔ ریحانہ گھر والے اور پورے خاندان والے کہتے ہیں لیکن میں نے خود اپنا نام تبدیل کر لیا اور ریحانہ سے علینا خان ہو گئی۔ اس کی وجہ بھی بہت بڑی ہے۔ خیر یہ نام مجھے اچھا لگا تھا۔ میری فرینڈز مجھے علینا کہہ کر پکارتی ہیں۔

میں چشتیاں کے ایک گاؤں منگیر شریف میں پیدا ہوئی۔ اپنے ماں باپ کی پہلی اولاد ہوں۔ ۵ سال تک میں اکلوتی ہی رہی۔ ماں باپ کی لاڈلی بھی ہوں۔ پھر مجھ سے

چھوٹی اِک بہن پیدا ہوئی۔ امی ابو بہت خوش تھے۔ مگر امی کو بیٹے کی خواہش بہت زیادہ تھی۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس طرح ہم پانچ بہنیں ہو گئیں۔ امی ابو کے پیار میں کمی نہ آئی مگر اکثر امی مجھے تنقید کا نشانہ بناتی تھیں۔ میری عمر اب دس سال تھی۔ میں اور میری دو چھوٹی بہنیں سکول پڑھنے جاتی تھیں۔ پڑھنے کا شوق بھی بہت تھا۔ گورنمنٹ گرلز سکول کے برآمدے میں کپڑے کے ٹاٹ پر بیٹھنا اور اُونچی اُونچی آواز میں الف انار ب بکری یاد کرنا...... آہ! کیا وقت تھا۔ بچپن کی یادیں ساری عمر پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ زندگی کے کسی موڑ پر اچانک آ کر ملتی ہیں اور آنکھوں میں تھوڑی سی نمی بھی چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔

اب کی بار امی پھر امید سے تھیں کہ اب ان شاء اللہ بیٹا پیدا ہوگا۔ ہم بہنیں ہر وقت اللہ میاں سے دعائیں کرتیں کہ اللہ میاں ایک چھوٹا سا کاکا ہمیں بھی دے دو۔

امی ابو ہر دربار پہ گئے۔ ہر سال کی طرح منتیں مانیں، پیروں سے تعویذ اور ہر ٹونے پر عمل کیا گیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میں اور میری بہنیں سکول میں تھیں کہ ابو ہاتھوں میں ٹافیوں کا پیکٹ لیے سکول کے گیٹ کے پاس آئے اور بچوں کو بلایا اور ٹافیاں بانٹنی شروع کر دیں۔

میں نے ابو سے پوچھا ''کس خوشی میں بانٹ رہے ہو ٹافیاں؟''

''ارے پگلی! تیرا بھائی پیدا ہوا ہے۔''

''کیا...... سچ ابو......'' ہم تینوں بہنوں نے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔

کیا خوشی تھی ہمارا بھائی پیدا ہوا ہے۔ ہم پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی۔ خدا نے ہم پر احسان کر دیا۔ گول مٹول سا گوری رنگت، نازک سا...... اوئے رو تو نہ...... دیکھ تیری بہنیں آ گئیں۔

دائی ماسی نے منے کو میرے ہاتھ میں دے دیا اور میں نے اُسے کئی پیار کیے اور بہنوں نے منے کو مجھ سے لے لیا۔ ہم نے بھی تو پیار کرنا ہے۔ منا ہمارا بھائی بھی تو ہے نا......

منا کیا آیا گھر میں رونق خوشی کا بازار لگ گیا۔ ابو نے پورے محلے میں مٹھائی بانٹی۔ کیا دن تھے وہ......

منے کی خوشی میں ابو نے ہمیں ٹی وی لے دیا۔ میں تب چھٹی کلاس میں تھی۔ ٹی وی کے ساتھ تو میری دوستی ہو گئی۔ میں اور میری سہیلیاں سکول سے آتے ہی ڈرامے دیکھتیں اور پروگرام۔ تین سال گزرنے کے بعد ٹی وی خراب ہو گیا۔ ابو سے بہت ضد کی اور بڑی عید پہ ہمیں بڑی خوشی ملی۔ ابو نے ہمیں ٹی وی لا دیا اور وہ بھی رنگین۔ اور پھر تو ڈرامے دیکھنے کا جو مزہ آتا تھا۔ پورے محلے کی لڑکیاں آ جاتی تھیں۔ امی بہت ناراض ہوتی تھیں اور ڈانٹ بھی خوب پلاتی تھیں۔ بس یونہی امی سے چھوٹی چھوٹی بات پر ڈانٹ پڑنے لگی اور ایک تو میں ضدی بہت تھی۔

نئے ڈرامے کی آج پہلی قسط تھی۔ میں اور میری ہمراز بچپن کی سہیلی فاطمہ بے چینی سے کمرشل ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔ آخر کار ڈرامہ شروع ہوا۔ اس ڈرامے کا ایک اداکار نوجوان بہت خوبصورت تھا۔ اور کیا کمال کی ایکٹنگ تھی اُس کی۔ فاطمہ اور میں ہم دونوں اس کی فین ہو گئیں۔

دوسرے دن ہم کلاس میں بیٹھی اس نئے ڈرامے کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں کہ فاطمہ نے کہا ''اُس ایکٹر اور ریحانہ کا جوڑ ہے۔ دونوں کی شادی ہو جائے تو جوڑی خوب جچے گی۔ زیادہ سے زیادہ سات سال بڑا ہوگا اور حسن میں ریحانہ او سوری میرا مطلب اپنی علینا بھی کم نہیں ہے۔''

بس پھر تو یہ مذاق بن گیا اور میں پگلی یہ سوچ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ اکثر راتیں اُس شخص کے خواب دیکھتے دیکھتے گزر جاتیں۔ ہر پل اللہ میاں سے دعا کرتی کہ اِک بار اس شخص سے ملا دے اور پھر تو یہ بات پورے خاندان میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ میری کزنیں مجھے اُس کے نام کی دیوانی کہہ کر چھیڑتی تھیں۔ زندگی یونہی کچے رستوں پر اِک معذور شخص کی طرح گزرتی چلی جا رہی تھی اور میں تو اُس شخص کے پیار میں اتنی ڈوب گئی کہ اپنے اردگرد کا ہوش بھی نہ رہا۔ میں تو بس اُڑ کر اُس کے پاس جانا چاہتی تھی۔

یونہی دن مہینے اور مہینے سالوں کا لباس پہنتے رہے اور وہ دن بھی آ گیا جب اپنے خوابوں کا گلا گھونٹ کر انہیں یادوں کے قبرستان میں دفنانا پڑا تھا۔ آج میرا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ تایا زاد عرفان علی سے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اب بھی ایسا لگتا تھا کہ اِک دن وہ شخص میرا ہوگا مگر یہ خیال تو خیال ہی رہا۔ میری ایک نہ سنی گئی اور یوں میری شادی ہو گئی۔

میں نے خود کو ایک اچھی بیوی ثابت کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر عرفان نے کبھی مجھے نہیں سمجھا۔ وہ ہر وقت مجھ پر تشدد کرتا تھا۔ شادی کے بعد میں نے ٹی وی دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ عرفان کے اور لڑکیوں سے بھی مراسم تھے اور پتہ نہیں کیوں مجھے اچھا نہیں لگتا تھا اور ایک دن میں نے اُس سے اس بارے میں بات کی کہ میں نے تمہارے کہنے پہ سب کچھ چھوڑ دیا۔ خود کو بدل ڈالا مگر تم یہ بے وفائی کیوں کر رہے ہو مگر اس نے درندگی کی انتہا کر دی اور بیلٹ سے مجھے بہت مارا۔

یوں بات امی ابو تک پہنچ گئی اور میں روٹھ کر میکے آ گئی۔ مجھے عرفان سے سخت نفرت ہو گئی تھی اور کئی بار ساس سسر منانے کے لیے بھی آئے مگر میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ عرفان خود آئے۔ مگر وہ ضدی انسان نہ آیا۔ عرفان کا جس لڑکی سے رابطہ تھا اُس کے والدین نے کہا کہ اگر تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو تو ہم اپنی بیٹی کی شادی بھی تم سے کر دیں گے اور دُبئی کا ویزہ بھی دیں گے۔ عرفان تو ویسے ہی لالچی تھا اور ایک دن وہ آیا۔ میں خوش تھی کہ چلو دو ماہ بعد ہی سہی مجھے منانے تو آیا مگر یہ خوش فہمی جلد ہی دور ہو گئی اور اس نے طلاق کے پیپر میرے ہاتھ میں تھمائے اور چلا گیا۔ میرا بی پی لو ہو گیا تھا اور میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں میں بہت ہی کمزور ہو گئی تھی۔ مجھے اس بات سے بہت دکھ پہنچا تھا لیکن وقت زخموں پہ مرہم ضرور رکھ دیتا ہے۔ میں نے بس اب ضد کر لی کہ شادی کبھی نہیں کروں گی اور اپنی محبت کو حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گی۔ امی اب بھی مجھے قصوروار سمجھتی ہیں۔ وہ اب بھی مجھ میں خامیاں تلاش کرتی رہتی ہیں۔ میں نے بیوٹیشن کا کورس کیا ہوا تھا اور اب گھر میں ہی اپنا بیوٹی پارلر کھول لیا تھا۔ ہیر بیوٹی پارلر......''

ڈائری پڑھتے پڑھتے مجھے اب تھکن کا احساس ہونے لگا تھا یا پھر اپنے دشمن ساتھی سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی تو لیٹر سے سگریٹ سلگایا اور کش لینا شروع کر دیے۔

ڈائری بند کرنے لگا تھا مگر دل چاہا کہ آگے پڑھوں۔ کتنی عجیب محبت تھی اُس لڑکی کی۔

آگے لکھا تھا ''میں نے پھر سے ٹی وی دیکھنا شروع کر دیا اور بس وہ شخص جب نگاہوں کے سامنے آتا تو دل میں مری ہوئی لاوارث حسرتیں پھر سے زندہ ہونے لگتیں۔

اب بہت خواہش تھی کہ میں اُس سے بات کروں اور یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں۔ کیوں کہ اب گھر میں ہر وقت فساد، امی کے طنز برداشت سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔

ایک دن فاطمہ نے کہا کہ اُس کا ایک رشتہ دار ٹی وی وغیرہ پہ کام کرتا رہا ہے اور اس کے رابطے ہیں وہ مجھے اس کا نمبر ضرور لے دے گا۔ میں نے تو بے چینی سے اُسے کہا کہ مجھے ابھی انکا نمبر دو۔ یوں رمضان صاحب سے میری روز بات ہوتی تھی۔ وہ ایک بہت ہی اچھے انسان تھے اور سچ میں انہوں نے اس معاملے میں میری بہت مدد کی۔ انہوں نے مجھے ایک ڈائریکٹر کا نمبر دیا۔ محمد حسین ڈوگر صاحب کا...... وہ

اس ایکٹر کے دوست بھی تھے۔ مگر انہوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ میں یہ سب غلط کر رہی ہوں۔ یہ سب خوابوں میں ہی ہو سکتا ہے مگر دل کے ہاتھوں میں بہت مجبور تھی۔

میں نے ڈوگر صاحب سے بہت منتیں کیں اور ان سے کہا کہ وہ مجھے ڈراموں میں کاسٹ کریں۔ مگر انہوں نے کہا کہ وہ سوچ کر مجھے بتائیں گے۔ ایک دن مجھے ایک رونگ نمبر سے کال آئی۔

میں نے کال ریسیو نہیں کی تو ایک میسج آیا کہ میں ڈوگر کا اسسٹنٹ ہوں اور میں اس معاملے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ مگر بشرطیکہ آپ boss کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔ وہ شخص اتنی ہمدردی سے بات کرتا تھا کہ مجھے اس کی ہر بات پہ یقین ہوتا گیا۔ اب میری ڈوگر صاحب سے بہت ہی کم بات ہوتی تھی۔ کیونکہ جب بھی بات ہوتی تھی وہ مجھے لیکچر دیتے اور یہ بھی کہتے کہ وہ شخص بہت مغرور اور گھمنڈی ہے۔ آپ اپنا وقت برباد نہ کرو اور شادی کر کے اپنا گھر بساؤ۔ بس مجھے یہ لیکچر اچھا نہیں لگتا تھا اور منہ بسور کر رہ جاتی۔ اسسٹنٹ کا نام افروز فیصل تھا۔ ایک دن اس نے کہا کہ میں اپنی تصویریں اُس کو بھیجوں اور اُس نے اُس ایکٹر سے میرے بارے میں بات بھی کی ہے۔ تو وہ مجھے دیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے اپنی تین تصویریں اُنھیں MMS کر دیں اور افروز نے مجھے اس بات پر قائل کرنا شروع کر دیا تھا کہ میں گھر بار چھوڑ کر اُس کے پاس آ جاؤں اور وہ مجھے میری محبت سے بھی ملا دے گا اور ڈراموں میں کام بھی دلوائے گا۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے رمضان سے بھی بہت مشورے لیے اور انہوں نے بھی مجھے منع کیا کہ میں ایسا ہرگز سوچوں بھی نہ۔ وقت یوں ہی معمول کی طرح گزر رہا تھا۔ میری طبیعت بالکل صحیح نہیں رہتی تھی۔ ہفتے میں ایک دن بخار ہو جاتا تھا اور میں کمزور ہو گئی تھی۔ رنگت بھی پیلی ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن ایک رونگ نمبر سے کال آئی۔ پتا نہیں کون تھا مگر آواز اور بات کرنے کے انداز سے میں بہت امپریس ہوئی۔ بس کبھی chating بھی ہو جاتی تھی۔ یوں وہ اجنبی سے دوست بن گئے۔ بہت ہی نائس انسان تھے۔ میں نے جب انہیں اپنے بارے میں بتایا تو انہوں نے مجھے پاگل نمبر 1 کہا۔ نیز یہ سب تو ہنسی مذاق میں اکثر وہ کہتے رہتے تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھے سرپرائز دیا اور یہ کہ اُس اداکار کا نمبر مجھے دیا۔ پہلے پہل تو میں نے یقین نہ کیا مگر جب میں نے اُس نمبر پر کال کی تو وہ واقعہ میں انہی کا تھا۔ مگر کبھی اس سے بات نہ ہوئی۔ وہ میسج کا جواب دیتا اور نہ ہی کال ریسیو کرتا تھا لیکن اجنبی آج کل مجھے بہت لیکچر دیتے اور بس ایک دن ان سے سخت کلامی ہو گئی۔ انہوں نے مجھے بہت سمجھانے کی کوشش کی اور بس اتنا کہا کہ دوست میں دعا کروں گا کہ خدا تمہارے حال پر رحم کرے اور تمہیں گمراہی کے اندھیروں سے نکال دے۔''

اور یہ بھی کہا کہ ایک دن بہت پچھتاؤ گی۔ یہ شاید ان کی پیشین گوئی تھی یا بددعا یا انہوں نے وقت کی نازک چال کو پہچان لیا تھا۔

فاطمہ سے بھی میری لڑائی ہو گئی اور دوستی دشمنی میں بدلتی چلی گئی۔ کبھی کبھی مجھے وہی قصوروار لگتی ہے۔ نہ وہ سکول میں اس کا نام لے لے کر مذاق کرتی اور نہ میں یوں جنونِ عشق میں گرفتار ہوتی۔

لیکن اُس نے مجھے سمجھایا بھی تو تھا نا مگر پتہ نہیں کسی کا لیکچر مجھے زہر لگتا تھا۔ آج میری ساس آئی تھیں اور امی نے خوب ان کی خدمت کی اور کافی دیر ہنسی مذاق چلتا رہا مگر جب امی نے یہ کہا کہ تمہارے بیٹے کا کوئی قصور نہیں یہ میری ریحانہ ہی پاگل ہے۔ مجھے ایسے لگا جیسے سر پر سات منزلہ عمارت گر پڑی ہو۔ اس کے بعد عدنان بھی کبھی کبھی چکر لگا لیتا اور یوں میں پورے خاندان میں قصوروار بن گئی اور وہ معصوم......

افروز نے آج ایک فائنل بات کی تھی کہ اگر اپنی محبت کو پانا ہے تو لاہور آ جاؤ اور یہاں ماڈلنگ کرو اور آہستہ آہستہ شوبز میں تمہاری جگہ بن جائے گی اور تم اُس شخص کے قریب ہو جاؤ گی۔ میری کبھی یہ خواہش تو نہیں تھی کہ وہ مجھ سے شادی کرے۔ بس میرا دوست بن جائے مجھ سے باتیں کرے۔ ہمیشہ ایک اچھا دوست رہے۔ آخرکار عیدالفطر کے بعد میں نے ارادہ کر لیا کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں گی۔ افروز مجھے لینے کے لیے آیا اور اس دن میں بہت گھبرائی۔ مجھے لگا تھا کہ میں اِک دلدل میں پھنسنے والی ہوں۔ افروز کی باتوں نے تسلی دی اور یوں میں لاہور آ گئی۔ اُس نے ایک فلیٹ مجھے رہنے کے لیے دیا۔ اُس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ افروز نے کہا کہ میں دو تین دن خوب رو لوں یعنی خود کو ہر پریشانی سے آزاد کر لوں پھر وہ بتائے گا کہ آگے کیا کرنا ہے اور وہ چلا گیا۔ وہ روز آتا اور مجھ سے باتیں کرتا اور ضرورت کا سامان دے کر چلا جاتا۔ میرے ذہن سے سارے وہم نکل گئے اور افروز سچ میں مجھے ایک اچھا انسان لگا تھا مگر ایک رات میں فلیٹ میں سو رہی تھی کہ افروز اپنے 2 ساتھیوں کے ساتھ شراب کے نشے میں آیا۔ چونکہ ایک چابی اُس کے پاس بھی تھی اور اس نے میری محبت کا مذاق اُڑایا۔ میں لٹ چکی تھی اور یوں اس نے مجھے کمرے میں بند کر دیا اور چلا گیا۔ ایک دن پھر آیا اور مجھ سے معافی مانگنے لگا۔ میں نے کہا کہ خدا کے واسطے مجھے واپس گھر جانے دو۔ بہت منتیں کیں مگر وہ نہ مانا اور پھر سے درندگی کی انتہا کر دی۔

کاش زمین پھٹ جاتی اور میں ہمیشہ کے لیے غرق ہو جاتی۔ آخرکار ایک دن میں وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ میں اب بالکل نہیں جینا چاہتی تھی۔ ایک رستہ رہا تھا صرف خودکشی۔ اب میں بہت تھک چکی تھی اور فٹ پاتھ پر بے ہوش ہو گئی۔ آنکھ کھلی تو خود کو ایک بہت بڑے اور بہترین ڈیکوریٹڈ بیڈروم میں موجود پایا۔ کیا میں اک بار پھر پھنس چکی ہوں۔ مجھے وہ سب یاد آنے لگا۔ میری ڈر کے مارے چیخ نکل گئی تھی۔ دروازہ کھلا اور ایک پینتالیس سالہ عورت آئی۔ میرے ماتھے پہ ہاتھ رکھا کیونکہ مجھے بہت سخت بخار تھا۔ انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا گھبراؤ نہیں بیٹی مجھے اپنی ماں ہی سمجھو اور یہاں مجھے دوسرا دن تھا۔ انہوں نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا اور مجھے ایک بیوٹی پارلر میں جاب دلا دی مگر اب بھی میں ان کے گھر رہتی تھی۔ نفیسہ بیگم بہت ہی پیار کرنے والی اور ہمدرد خاتون تھیں لیکن وہ محبت کا نشہ اب بھی مجھ پر سوار تھا۔ آج گھر والے بہت یاد آ رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ لوگ کس طرح جی رہے ہوں گے۔ آج مجھے خود سے سخت نفرت ہوئی تھی اور بس اب میں بالکل نہیں جینا چاہتی تھی۔ میں تو قاتل ہوں۔ میں نے قتل کیے اپنے گھر والوں کی عزت کو قتل کیا اپنی عزت کو قتل کیا۔ میں اب مزید ذلت و ندامت کی زندگی نہیں جی سکتی تھی۔ ابو پلیز مجھے معاف کر دینا۔ امی آپ بھی آج میں خود کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گی۔ آپ سب ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ شاید میرا انجام یہی ہونا تھا اور دُکھ کی بات تو یہ تھی کہ جس کی میں دیوانی تھی، جس کے پیار میں اتنے آگ کے دریاؤں میں کود گئی اور وہ آج بھی اپنی دھن میں زندگی جی رہا ہے۔ اللہ میاں! آپ بھی مجھے معاف کر دینا۔

نیچے آخری لائن پر اُس کے دستخط تھے اور آخری صفحہ پر آنسوؤں کے قطروں سے لکھے گئے الفاظ ڈوبے ہوئے اور دھندلے دھندلے سے ہو گئے تھے۔

مگر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا کہ کیونکہ میں ہی وہ اجنبی تھا جس سے وہ کبھی کبھی بات کرتی تھی اور ہمیشہ میرے لیکچر پہ خفا ہو جاتی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ میں اپنی اجنبی دوست کو نہ بچا سکا تھا۔ بہت تلاش کیا مگر وہ جا چکی تھی ہمیشہ کے لیے......!!

آج کا ادیب اپنی سماجی ذمہ داریاں نہیں نبھا رہا

پارٹیشن سے پہلے اچھا ماحول تھا لوگ مذہبی جنون میں مبتلا نہیں تھے

مایوسیاں، پریشانیاں اور ناکامیاں مل کر مجھے شاعری کی طرف کھینچ لائیں

ادبی مراکز سے دوری کا احساس وسائل کی مجبوریوں کے نیچے ہی دب کر رہ گیا

آدمی جب ایک دفعہ عشق میں ناکام ہو جائے تو پھر وہ ہرجائی ہو جاتا ہے

معروف شاعر خورشید مستانہ سے عامر بن علی کا خصوصی انٹرویو

خورشید مستانہ پنجاب کی لازوال شعری روایت کے امین ہیں۔ منیر نیازی کی رائے میں اُن کی شاعری کے موضوعات ہمارے معاشرے کے موجودہ طرزِ زندگی کے اہم حقائق کے بارے میں ہیں۔ جن کو وہ بڑے گہرے اور صاف انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جو کہ ان کے ہم عصر شعراء کرام میں بہت کم ہے۔ بقول ڈاکٹر انعام الحق جاوید ان کی شاعری کا لب و لہجہ استادانہ مہارت پر مبنی ہے۔ عمر کی ستر بہاریں دیکھ چکے ہیں مگر ان کی شاعری میں اب بھی جذبوں کی جوانی اور روانی چھلکتی ہے۔ پنجاب کے مشاعروں می ان جیسی پذیرائی، داد اور واہ واہ کم ہی شعراء کو نصیب ہوتی ہے۔

ارژنگ: اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

خورشید مستانہ: میری پیدائش مشرقی پنجاب کی ریاست نابھہ کے علاقہ مانانوالہ برج میں ہوئی۔ تاریخ پیدائش کے بارے میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن قیام پاکستان کے وقت میری عمر سات سال کے قریب تھی۔ ہجرت کے واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ میرے والد صاحب مشرقی پنجاب سے پاکستان کی جانب ہجرت کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ ان کی شہادت میری آنکھوں کے سامنے ہوئی تھی۔ ان کا جسد مجھے اب بھی یاد ہے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد ابتدائی سال شدید کسمپرسی کے عالم میں گزارے۔ ۱۹۵۲ء میں جب مجھے سکول داخل کروانے کے لیے لے گئے تو انہوں نے میری عمر پر اعتراض کیا جو کہ بچوں کے سکول داخل ہونے کی عمومی عمر سے کافی زیادہ تھی۔ خیر میری عمر کم لکھوا کر سکول داخل کروا دیا گیا۔ میٹرک میں نے میاں چنوں ہائی سکول سے کیا اور سکول کے ستر طالب علموں میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔

ارژنگ: قیام پاکستان سے پہلے کا سماجی ماحول کیسا تھا؟ آپ تو رہتے بھی سکھ اکثریت علاقے میں تھے؟

خورشید مستانہ: پارٹیشن سے پہلے اچھا ماحول تھا۔ لوگ مذہبی جنون میں مبتلا نہیں تھے۔ یہاں تک کہ کئی مسلمانوں اور سکھوں نے آپس میں پگیں تبدیل کی ہوئی تھیں جو کہ پنجاب میں منہ بولے بھائی کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا میرے والد صاحب کو سکھوں نے شہید کر دیا تھا لیکن ہمیں با حفاظت پاکستان کی سرحد تک پہنچانے والے بھی سکھ ہی تھے۔ مارنے والے بھی سکھ تھے اور بچانے والے بھی سکھ تھے۔ اس لیے تمام لوگوں کے بارے میں ایک بیان زیادتی ہوگی۔

ارژنگ: شاعری کی طرف کب اور کیسے مائل ہوئے؟

خورشید مستانہ: جب میٹرک کر لیا تو نوکری کی تلاش شروع کی۔ مگر نوکری باوجود کوشش نہیں ملی۔ دکھ بہت سارے اکٹھے ہو گئے اور اتنے زیادہ ہو گئے تھے کہ شعر بن کر نکلنے لگ گئے۔ مایوسیاں، پریشانیاں اور ناکامیاں مل کر مجھے شاعری کی طرف کھینچ لائیں۔ غم روزگار اور غم جاناں نے مجھے شاعری کی طرف مائل کیا۔

ارژنگ: ہجرت کے بعد آپ نے اپنی تمام زندگی میاں چنوں میں گزاری ہے۔ ادبی مراکز سے دور ہونے کا احساس کبھی نہیں ہوا؟

خورشید مستانہ: ادبی مراکز سے دوری کا احساس وسائل کی مجبوریوں کے نیچے ہی دب کر رہ گیا۔ مزدور کو مرکز سے بھلا کیا تعلق؟ تعلیم ادھوری رہی کہ ہمارے شہر میں کوئی کالج نہیں تھا اور دوسرے شہر جا کر تعلیم حاصل کرنے کے وسائل نہ تھے۔ بس میں کنڈیکٹر کے طور پر روزگار کا آغاز کیا۔ تین سال کنڈیکٹری کی اور پھر تین سال بسوں میں چیکر رہا۔ بس بسوں میں بھی شعر لکھتا رہا۔ ذہن پر شاعری اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ اپنے گرد و پیش کے کام تو بس خوابیدہ انداز میں ہی سرانجام دیتا رہا۔ دل و دماغ تو شاعری میں پوری طرح جکڑا ہوا تھا۔

ارژنگ: پہلا شعری مجموعہ کب شائع ہوا؟

خورشید مستانہ: پہلا شعری مجموعہ ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا جو کہ مزاحمتی نظموں پر مشتمل تھا۔ بہت سارا کلام تو ضائع ہو گیا۔ ۲۰۰۵ء میں ''سہکدے پھٹ'' کے عنوان سے کتاب شائع ہوئی۔ آج کل بھی ایک مجموعہ زیر طبع ہے مگر ابھی تک اُس شعری مجموعے کا نام فائنل نہیں کر سکا۔

ارژنگ: آپ کی تمام شاعری پنجابی زبان میں ہے کبھی اُردو میں لکھنے کے متعلق نہیں سوچا؟

خورشید مستانہ: اُردو لکھنے کا کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ پنجابی ماں بولی تھی اس لیے کسی لغت کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اُردو میں لکھنے کے لیے زیادہ جدوجہد کرنا پڑتی، لغات اور عروض کا مطالعہ کرنا پڑتا۔ پنجابی زبان میں ہی خواب اور خیال آتے تھے اسی لیے مناسب بھی یہی لگا کہ ماں بولی کے

ذریعے ہی لوگوں سے اور خود سے ہم کلام ہوا جائے۔

ارژنگ: آپ عملی سیاست میں پچھلے چالیس سال سے سرگرم ہیں۔ کئی بار کونسلر منتخب ہوئے ہیں اور عوامی جلسوں میں سیاسی نظمیں پڑھتے ہیں۔ سیاست میں کیسے آئے؟

خورشید مستانہ: سیاست میں تو سیاستدان مجھے کھینچ لائے۔ آپ کے سوال کے جواب میں منیر نیازی کا صرف یہ شعر پیش کروں گا:

کج انج وی راہواں اوکھیاں سن، کج گل وچ غم دا طوق وی سی
کج شہر دے لوگ وی ظالم سن، کج سانوں مرن دا شوق وی سی

ارژنگ: کیا زندگی میں کبھی عشق کیا؟

خورشید مستانہ: عشق کیا اور بھرپور کیا۔ میرے نام کی نسبت اسی عشق کی ہے۔ اگر عشق کا تڑکا نہ لگے تو شاعری بے کار ہے۔ مگر ایک بات ہے آدمی جب ایک دفعہ عشق میں ناکام ہو جائے تو پھر وہ ہرجائی ہو جاتا ہے۔ وہ ہر محبت میں پہلی محبت کا نشہ اور سرور تلاش کرتا ہے مگر پہلی محبت جیسی سرشاری اور بے خودی دوبارہ کسی محبت میں نصیب نہیں ہوتی۔ آج کل تو حالات ہی کچھ اور ہیں۔ عشق موبائل فونوں پر ہوتے ہیں۔ ہمارے وقت میں تو کہانی ہی دوسری تھی۔

''چھلادے جانشانی تیری مہربانی''

ارژنگ: کیا آج کا دانشور اور ادیب اپنا صحیح کردار ادا کر رہا ہے؟

خورشید مستانہ: میں نہیں سمجھتا کہ آج کا ادیب اور دانشور طبقہ اپنا کردار نبھا رہا ہے۔ ادیب اور دانشور اپنی سماجی اور معاشرتی ذمہ داریاں نبھانے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ مصلحت اندیشی کا دور دورہ ہے۔ شاعر کا معاشرے میں وہ کردار نظر نہیں آتا جو ہوا کرتا تھا۔ سچائی اور انصاف کا ساتھ دینے کی بجائے ذاتی مفادات کو ترجیح دینا تو کسی بھی شخص کے لیے جائز نہیں ہے۔ اہل قلم پر تو انصاف اور سچائی کے ساتھ کھڑے ہونے کی شرط تو یوں بھی لازم ہے کہ ہم لوگ ان بلند اخلاقی رویوں کی تبلیغ کرتے ہیں۔ جس محبت اور وفاداری کا ذکر ہم لوگ اپنی شاعری میں کرتے ہیں ہمیں عملی زندگی میں بھی ان پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

نعت

صاحبزادہ رشید عثمانی/خیر پور ٹامے والی

تیرا اسم پاک محمدؐ اے محبوبِ خدائے رحیم
تیرا لقب ہے رحمت عالم تیری ذات شفیق و کریم

تو ہے جانِ بزمِ ہستی اوّل و آخر تیرے ہیں
سارے زمانے تیرے تابع، سارے جہاں تیری اقلیم

تیرے قدم افلاک نے چومے، پہنچا ہے معراج پہ تو
عرشِ علیٰ تک حور و ملک میں ہوتی ہے تیری تکریم

تیری آمد سے دنیا میں جشن مسرت بپا ہوا
تیرے نور سے چمکے دو عالم اے مکے کے دُرِ یتیم

تو ہے مزمل، تو ہے مدثر، تو ہے طٰہٰ، تو یٰسین
سر پر تاجِ ختم نبوت، معجزہ ہے قرآنِ حکیم

ہادیٔ برحق تجھ کو بنا کر بھیجا تو اصلاح ہوئی
دیکھ رہا تھا ساری ابتری آپ خدائے خبیر و علیم

سارے جہاں نے اپنا رہبر برحق تجھ کو مان لیا
تیرے پیام کے آگے جھک گئے سب نظریے جدید و قدیم

اور کسی سے غرض نہیں ہم کو اے اللہ کے پیارے رسولؐ
رُوح میں تیرا نام اُترا ہے، تیری محبت دل میں مقیم

تیرا قول و عمل ہے تیرے برحق ہونے کی تائید
جان گیا ہے دیدۂ بینا، مان گئی ہے عقل سلیم

جو چاہے لوگوں میں بانٹے جتنا چاہے جس کو دے
تیرے حوالے کی اللہ نے اپنے خزانوں کی تقسیم

تیری حیات کا لمحہ لمحہ راہنما ہے دُنیا کا
تیری راہ پہ چلنے والے بنتے ہیں انسان عظیم

تیری خاکِ پا کو چومنے والے بنے خورشید و ماہ
تیرے دیوانے دنیا میں ٹھہرے سب سے عقیل و فہیم

تیرے رُخِ انور کی جھلک سے رنگ ملے گلزاروں کو
تیرے پسینے کی خوشبو نے بھر دی ہے پھولوں میں شمیم

اُس کی زیارت سے ملتی ہے طراوت بادِ بہاری کو
کر کے طواف تیرے گنبد کا چلتی ہے ہر روز نسیم

تیرے در کے منگتوں کی ہے دُنیا کے شاہوں میں دُھوم
تیرے غلاموں کی ٹھوکر میں تاجِ شہنشاہی زر و سیم

نہیں رشید کی جھولی خالی تیری آلؑ کے صدقے میں
تیرے در کے گداؤں پر ہیں خالق کے الطاف عمیم

معروف شاعر نیازت علی نیاز کا
پہلا شعری مجموعہ
''جنوں معراج پاتا ہے''
اشاعت کے آخری مراحل میں
اہتمام: نستعلیق مطبوعات
فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اُردو بازار، لاہور
0300-4489310

معروف شاعر حسن عباسی کی
شاعری سے انتخاب
''وہ آنکھ کتنی شرارتی ہے''
مرتبہ: صائمہ ملک
اہتمام: نستعلیق مطبوعات
فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اُردو بازار، لاہور
0300-4489310

فوزیہ غزل اہم ناول نگار

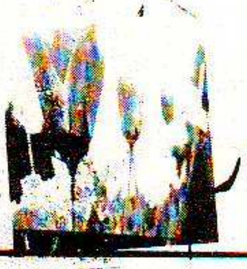

رائے عابد علی

شاعری کا سمندر ایک ایسا بحر بیکراں ہے کہ جس میں جب تک ڈوبا نہ جائے کوئی موتی ہاتھ نہیں آتا اور تخلیقی کرب کا اظہار ہمیشہ دل کو لہو کر کے ندرتوں کا موسم نکھارتا ہے۔ اس کرب کو سہنے، خود پہ جھیلنے اور اس کا ثمر دوسروں تک بلا اجر پہنچانے والے یقیناً عظیم ہیں۔ علم انبیاء کی میراث ہے اور تخلیق صفت خداوندی کا اِک عطائی تحفہ اور اس کا بار چنیدہ لوگ ہی اُٹھا پائے ہیں۔

شیخوپورہ جو ایک تاریخی وثقافتی شہر ہونے کے ساتھ اب معروف ادبی حیثیت کا حامل ہے اسی شہر نے یہاں معتبر اصناف کو زندہ رکھنے کے ساتھ مستند قلمکار پیدا کیے۔ اسی شہر سے اِک نام بہت کم سنی میں چمکا۔ فوزیہ غزل جو کہ معروف ناول نگار، افسانہ نگار، شاعرہ ہونے کے ساتھ ایک منفرد طرز کی فیچر رائٹر ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں ساتویں کلاس سے اپنے تخلیقی سفر کا باقاعدہ آغاز جنگ گروپ کے سب سے زیادہ بکنے اور پاکستان کے سب سے کثیر الاشاعت میگزین ''اخبار جہاں'' سے کیا۔ جبکہ ڈائجسٹ کی دُنیا میں جاسوسی پبلی کیشنز کے سب سے زیادہ ریڈر شپ رکھنے والے ماہنامہ پاکیزہ میں ان کا پہلا افسانہ ''اب خوف نہیں کوئی'' لگا اور پاکیزہ ہی کی جانب سے انہیں پہلے ہی سال ۱۹۹۵ء میں نیو بیسٹ رائٹر ایوارڈ کے ساتھ ایوارڈ برائے حسن کارکردگی دیا گیا اور محض ۱۵ سال کی عمر میں جبکہ وہ میٹرک کی طالبہ تھیں ان کی اوّلین تحریروں پر یہ پذیرائی وحوصلہ افزائی ان کے آگے کے سفر کے لیے معاون ومثبت ثابت ہوئی اور بہت جلد وہ ملک کے معتبر ادبی مجلہ ماورا انٹرنیشنل کے ساتھ منسلک ہو کر معروف ادبی شخصیات مثلاً امرتا پریتم، ساحر لدھیانوی، محسن نقوی پہ تحقیقی وعلمی مقالے لکھنے کے ساتھ نوائے وقت، جنگ اور خبریں کے لیے اہم معاشرتی اور سماجی مسائل پر فیچرز لکھنے لگیں۔ ان کے فکر انگیز موضوعات کی بدولت یہ فیچرز پڑھنے والوں کو متاثر کرنے لگے۔ علاوہ ازیں فوزیہ غزل نے شاعری کے ساتھ افسانہ نگاری اور ناول نگاری پر بھی توجہ دی۔ ان کی خوبصورت شاعری اور اہم عصری وفکری موضوعات پہ افسانے معروف اور معتبر ادبی جرائد ورسائل میں پذیرائی پانے لگے۔ ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۸ء تک انہوں نے مسلسل ہر ماہ ہر اچھے ڈائجسٹ کے لیے افسانے وناول لکھے جن میں خواتین ڈائجسٹ، شعاع، کرن، آنچل، دوشیزہ، حور، دلکش، نازنین اور ماہنامہ حسینا میں ان کا نام ایک مستند، قابل اور موسٹ فیورٹ رائٹر کا حوالہ بن گیا۔ ان کے افسانے پڑھیں تو احساس ہوتا ہے کہ عامیانہ وسستے جذبات سے ہٹ کر اُنہوں نے ہر بار نئے، اصلاحی اور سبق آموز موضوع کو لے کر اپنی تحریر کا تانا بانا بنا۔ ان کے کردار بھرتی کے محسوس نہیں ہوتے نہ تحریروں میں بے جا فلسفہ اور یکسانیت ہے۔ بلکہ یہ کردار، ہمارے ہی اردگرد ہمارے ہی معاشرے کے فرد اور ہمارے ہی دُکھ سکھ کے عکاس ہوتے ہیں۔

خود اپنی تحریروں کے بارے میں فوزیہ غزل سے پوچھا گیا کہ وہ لکھتے وقت کن جزئیات کا خیال رکھتی ہیں تو اُن کا جواب تھا میرا لکھنے کا بنیادی مقصد اپنے لوگوں کو ان فکر انگیز باتوں سے مسائل کی آگہی وشعور دینا ہے جن سے ہم اکثر واقف ہونے کے باوجود چشم پوشی برتتے ہیں اور میں اپنی تحریروں میں موجود کرداروں کی گہری نفسیات اور عمیق مشاہدے سے کام لے کر پڑھنے والوں کو اچھی چیز دینے کی کوشش کرتی ہوں۔ کیونکہ یہ ہم لکھنے والوں کا فرض ہے۔ ہم اپنے قارئین کو صرف خوش رنگ خواب نہیں زندگی کے عذاب اور مسائل بھی دکھائیں کیونکہ پڑھنے والے ہماری تحریروں سے رویے، آئیڈیاز اور خیالات مستعار لیتے ہیں۔ سو ہمیں بطور قلمکار اپنے قلم اور حرف ولفظ کی حرمت کا پاس رکھنا چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ قاری کا بھی حق ہے وہ لکھنے والوں سے برابر سخت مطالبات دہراتے رہیں تا کہ ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے زندگی تخلیق ہو۔

فوزیہ غزل کا یہ تفکرانہ استدلال اور خیالی ستھرا پن ان کے پہلے مسلسل ناول ''عجب ہیں سلسلے وفا کے'' میں واضح نظر آتا ہے۔ خالص پاکستانیت اسلام اور دہشت گردی کے الزامات کی مغربی یلغار کا منہ توڑ جواب لیے یہ تحریر خواتین ڈائجسٹ کے ادارہ کے ماہنامہ حنا میں سلسلے وار لگی تو شاہکار تحریر قرار پائی اور پڑھنے والوں کی پسندیدگی واصرار پہ کتابی صورت میں منظر عام پر آئی تو فوزیہ غزل کو بشریٰ رحمٰن، انجم انصار، غزالہ رشید، خالد شریف جیسے معتبر افراد اور ادبی ناقدین سے قابل قدر ستائش وپذیرائی ملی۔ واضح رہے کہ اس ناول کے مین کردار پاک فوج سے تعلق رکھتے ہیں اور شاید پاک آرمی پہ یہ پہلا ناول ہے جو اتنا مقبول عام ہوا اور اس پہ ڈرامائی تشکیل کا بھی منصوبہ زیر غور ہے۔

مصنفہ کا دوسرا سلسلے وار ناول ''وہ ستارہ صبح اُمید کا'' حنا ڈائجسٹ میں ہی آ رہا ہے۔ مذکورہ ناول بین الکلیاتی مذاہب یہودیت، عیسائیت، ہندومت، جین مت، زرتشت، اسلام کے ساتھ نیوزی لینڈ، انڈیا اور چین کی ثقافت و روایات سے متعلق گراں قدر تحقیقی ومعلوماتی مواد لیے ہوئے ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ایک غیر مسلم لڑکی ہے جو روحانی و ذہنی سٹریس میں مبتلا اپنے مذہب سے باغی ہے۔ جبکہ بقیہ کردار پاکستانی معاشرے کے مڈل کلاس لوئر کلاس اور اپر کلاس طبقہ کے مسائل وحالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس ناول کا مطالعہ وموضوعاتی تفکر واضح کرتا ہے کہ مصنفہ نے اس پہ کس قدر محنت، مشاہدے اور عرق ریزی سے کام لیا ہوگا اور کتنی ریسرچ کی ہوگی کیونکہ دیگر مذاہب پہ لکھنا اور دوسری تہذیبوں کو بیان کرنا دقت طلب اور بڑا احتیاط آمیز کام ہے جو مصنفہ بحسن وخوبی ادا کرتی ہیں۔

''کالج سے خفا آنکھیں'' اور ''آؤ دیا جلائیں'' فوزیہ غزل کے یہ افسانے ڈرامائی صورت پانے کے ساتھ شائع شدہ دیگر افسانے، ناولٹ اور انفرادی ناولز انہیں پر اثر تحریروں کی خالق کے طور پر ہردلعزیزی و انفرادیت بخشتے ہیں۔ مثلاً شائع شدہ ناولز ''ابھی چاہتوں کو ثبات ہے''، ''محبت اب نہیں ہوگی''، ''موسم گنگناتے ہیں''، ''محبت گمشدہ

میری''، ''زردشال میں لپٹا چاند'' اپنے کرداروں کے پروقار صفات کے ساتھ ذہن و باصلاحیت ہیروئنز اور تصنع سے پاک ماحول بناوٹ سے عبرا لہجہ و تحریر اپنے پڑھنے والوں پر گہرا تاثر چھوڑتے ہیں۔ ان کی تحریروں کا اسلوب و طرز فکر اتنا دلنشین اور دلفریب ہے کہ قاری خود کو لفظوں، کرداروں سچویشن کے ساتھ بہتا محسوس کرتا ہے اور یہی ایک لکھنے والے کا کمال ہے کہ وہ قاری کو آخری حرف تک اپنے سحر میں گم رکھے۔ ان کی تحریریں اور کردار کسی ماورائی یا خوابی دنیا کا نقشہ پیش نہیں کرتے بلکہ اسی معاشرے اسی تہذیب کے حقائق وتلخیوں، خواہشوں کو لے کر چلتے ہیں۔

فوزیہ غزل نے جس طرح افسانہ و ناول نگاری میں بڑے اور مشہور ناموں کے درمیان اپنا الگ تشخص، انفرادیت پہچان پیدا کی اسی طرح شاعری کے میدان میں بھی وہ تیزی سے آسمان ادب پہ چمکیں اور ان کی شاعری اکثر و بیشتر ان کی تحریروں میں بھی آئی بلکہ ان کے ناول ''عجب ہیں سلسلے وفا کے'' میں شامل شاعری سچویشن کے حساب سے آئی اور یہ مصنفہ کے کمال فن کا ثبوت ہے۔

شاعری کا تذکرہ چھڑا ہے تو ایک حوالہ یہ بھی ہے کہ فوزیہ غزل معروف صحافی و کالم نگار شاعر ڈاکٹر ندیم اسلم کی چھوٹی ہمشیرہ ہیں گھر والوں کی خصوصی معاونت و حوصلہ افزائی کے ساتھ انہیں ادبی سفر میں اپنے بھائی کا بہت ساتھ میسر آیا۔

جبکہ علمی وادبی حلقوں میں وہ سب سے زیادہ محبت و خلوص کے ساتھ فوزیہ شفیق، انجم انصار اور ریحانہ علی احمد کا ذکر کرتی ہیں۔ بقول فوزیہ غزل کے میرے اب تک کے قلمی سفر میں مجھے سب سے بڑھ کر دوستی، حوصلہ افزائی، مدد اور مثبت تنقید و تعریف کے ساتھ اچھا بہتر اور زیادہ موثر لکھنے کی تحریک انہی سے ملی۔ خاص کر فوزیہ شفیق اور ماہنامہ کرن کی ریحانہ علی احمد کی محبتوں کے لیے میں ہمیشہ قدردان ہوں گی۔ ان لڑکیوں نے اپنے ایڈیٹوریل کی روڈ مزاج سے قطعاً پرے خلوص، اپنائیت، توجہ سے بصد اصرار مجھ سے لکھوایا، قیمتی مشورے دیے اور مجھے یہاں تک لانے میں بڑا اہم رول پلے کیا۔ بلکہ فوزیہ شفیق ہی وہ لڑکی ہے جس نے حنا کے لیے مجھ سے پہلا سلسلے وار ناول اس وقت لکھوایا جب میں زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا ہر چیز سے بیزار قلم و کاغذ سے پرے ہو چکی تھی۔ اس پیاری سی لڑکی نے مجھے جینے کا حوصلہ، ہمت دی۔

دوشیزہ کے ایڈیٹر ناصر رضا اور معروف پبلشر و ناشر شکیل عادل زادہ کے ساتھ وہ سلمیٰ کنول، محمود ریاض مرحوم اور سردار محمود صاحب کا ذکر بھی اپنے ادبی سرپرستوں میں بڑے احترام و عزت سے کرتی ہیں۔ فوزیہ غزل کی شاعری زیادہ تر ادبی پرچوں کے علاوہ معروف رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہے۔ تاہم نجی مصروفیات کے باعث مجموعہ کلام اشاعت میں لیٹ ہوتے گئے اور ناول و افسانے پہ توجہ زیادہ رہی۔ تاہم اب اُن کی طبع زاد اور غیر طبع شدہ شاعری جلد اشاعت کے مراحل طے کر کے خوبصورت کتابی شکل میں دستیاب ہوگی۔

فوزیہ غزل نے طویل نثری و آزاد نظموں کے ساتھ مختصر اور چھوٹی بحر میں بھی لکھا ہے۔ ان کی مختصر نظموں سے نمونہ کلام ملاحظہ کریں۔

''گزرگاہ'' (نظم)

زندگی جینے کے لیے
آنکھوں کو تیرا خواب بہت
اور خوش رہنے کے لیے
محبت کو تیرے دل کی ''گزرگاہ'' کافی ہے

''تیری یاد''

پھر دل کے روشن خانے میں
کچھ چہروں کے ہیں رُوپ سجے
پھر شب کے مے خانے میں
کچھ یادوں کے ہیں دیپ جلے
نام پہ تیرے
تاروں کے میلے لگے
اور ہم اُداس سی رات کے
تپتے سلگتے لمحوں میں
ہر آن جلے

''خواہش''

خوشبو کے ساتھ ہوا چلتی رہے
آنکھ تیرے خواب بنتی رہے
نیند دور کھڑی ہاتھ ملتی رہے
جب تک میرے ساتھ ہو تو
تب تک زندگی چلتی رہے

جب فوزیہ غزل سے پوچھا گیا کہ محض تیس سال کی عمر میں یہ مقام شہرت و پذیرائی اور اپنے اُوپر عطائے خداوندی کی خاص کرم نوازی کو کس انداز میں لیتی ہیں تو وہ انکساری سے مسکراتے ہوئے سادگی و عجز سے شاعرانہ انداز میں گویا ہوئیں۔

اُسی نے اُتارے آئینے لفظوں میں میرے
اُس نے حرف حرف کو زندہ کیا
اُس نے انداز جینے کا بتا کر
مجھے پائندہ کیا
اعتماد کے چمکتے
اعتبار کے دمکتے
سب چاند مجھ میں اُتار دیے
میری خراش خراش
بریدہ تر سوچوں کو
ارتکاز کے آثار دیے
معنی و مطلب کے سب مفہوم
واضح میری فکر میں کیے
اسی نے روشن کیے
میرے رات کے سفر میں دیے

اپنے رب کے حضور تشکر و عاجزی کا یہ اعتراف اُن کی فکر وسعت کی نکہتوں اور روحانی بالیدگی کا اظہار ہے جو اُن کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔ مصنفہ کی شاعری دیکھیں تو نظر سے قطع نظر یکسر ایک الگ اور مختلف طرز فکر کی حامل شاعرہ اُبھرتی ہے۔ فوزیہ غزل کی شاعری میں نسائی لہجہ، نسوانی وقار اور عورت کا خالص پن اُبھر کر سامنے آتا ہے اور وہ اپنے مخصوص انداز میں شدت سے خود کو منوا لیتی ہیں۔

اس دُعا کے ساتھ کہ منفرد لہجہ اور خوبصورت نسائی اسلوب کی حامل شاعرہ یہ فوزیہ غزل اپنے تخلیقی شعری و نثری سفر کے ساتھ تحقیقی و تعمیری مواد کی نشر و اشاعت کا سلسلہ کامیابی و کامرانی سے جاری رکھیں اور ہم ان کے علمی و قلمی جنون کی کاوش سے فیض یاب ہوتے رہیں۔ ان کی تازہ غزل کے کچھ اشعار آخر میں پیش ہیں:

''محبت کے جزیرے میں'' راؤ وحید اسد کا پہلا پڑاؤ

خورشید بیگ میلسوی

اُردو شاعری میں روز افزوں ترقی درحقیقت نوجوان شعراء کی مرہونِ منت ہے۔ کیونکہ اُردو شاعری اپنے ارتقاء میں انسان کی مثل ہے۔ ایک خوبصورت انسان جو ایک بچے میں بھی موجود ہے اور نوجوان میں بھی اور ایک پیرانہ سالہ شخص میں بھی۔ چنانچہ اُردو شاعری میں ہمیں پہلے، دوسرے اور تیسرے درجے کے شاعر موجود نظر آتے ہیں۔ خاور اعجاز نے اپنے مضمون میں راؤ وحید اسدؔ کو جنوبی پنجاب کے علاقے کا باشندہ ماننے سے انکار کیا ہے۔ تو اس کی وجہ ان کے نزدیک جو بھی ہو میرے خیال کے مطابق اس کی وجہ جنوبی پنجاب میں کراچی جیسے ماحول کا مفقود ہونا ہے۔ بلکہ آج کا کراچی تو کرب و بلا کی ساعتوں کا امین بن کر رہ گیا ہے۔ آج کے عہد کا ''کوفہ'' یا آج کے عہد کا ''کربلا'' جہاں ہر روز انسان عفریت بن کر اپنے جیسوں کو ذبح کرنے میں مصروف ہے۔ حالانکہ یہی شہر تہذیب و ثقافت کا اعلیٰ ترین نمائندہ شہر تھا۔ تو گویا جس طرح تہذیب و ثقافت کے بدلتے دیر نہیں لگتی، اسی طرح ماحول اچھا ہونے کے باوجود کسی بھی شخصیت پر اثر انداز نہ ہونے کی خامی رکھتا ہے۔ اپنے آپ میں گم شخص بظاہر منفی زندگی گزارنے والا محسوس ہوتا ہے۔ مگر دراصل وہ ماحول کے سمندر میں ایک ''جزیرہ'' دریافت کر چکا ہوتا ہے۔ سرائیکی یا جنوبی پنجاب کے اس شاعر نے بھی دنگا فساد، تعصب، منافرت، منافقت، جہالت، حرص و ہوس، جاگیردارانہ تہذیب کی طغیانی والی لہروں سے ہٹ کر ''محبت کے جزیرے'' پر خود کو منتقل کر لیا ہے اور ابتدائے حیات سے ہی وہ سب کو اس جزیرے پر آنے کی دعوت و ترغیب دے رہا ہے۔ تاکہ کشتیاں ڈوبنے سے پہلے ہر شخص اپنی منزل تک پہنچ سکے۔ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ ''محبت کے جزیرے میں'' راؤ حیدر اسد کا نقش اوّل ہے۔ جو ان کے مشاہدات اور حیاتی تشکیلات کی داستانِ پرجمال ہے۔ جسے انہوں نے اپنے من میں ڈوب کر اپنی زندگی کا سراغ لگانے کی سعی کامل کی ہے۔ کچھ اشعار دیکھئے:

رات کی تنہائیوں میں دُھند کے اس پار بھی
ساتھ میرے چل رہا ہے جگنوؤں میں بیٹھا شخص

کیا پوچھتے ہو حوصلہ مجھ سے پرند کا
اُڑتا ہوں پربتوں کو میں شانوں پہ ڈال کر

یہ جو دریا ہے آنکھ کا دریا
اس نے مجھ کو دیا نشانی میں

عہد حاضر کے شاعر و ادیب محترم عطاء الحق قاسمی نے انہیں شعر کو شعر بنانے کے ہنر سے بخوبی آشنا قرار دیا ہے اور وہ اس بات پر بھی افسردہ ہیں کہ آج کے دور میں تھوک کے حساب سے شعری مجموعے چھاپنے والے شاید یہ بھول چکے ہیں کہ ادب محض باتیں کرنے کا نام نہیں بلکہ یہ تو اشعار کی بنت اور مصرعوں کی بندش سے تشکیل پاتا ہے۔ یہاں ہم جناب عطاء الحق قاسمی کی رائے کے حوالے سے خواجہ حیدر علی آتش کا یہ شعر لکھ سکتے ہیں۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اگر اس خیال کو سامنے رکھ کر ہم آج کے نوجوان شاعر راؤ وحید اسدؔ کی شاعری کا بغور جائزہ لیں تو متعدد مرصع اشعار ہمارے زیرِ مطالعہ آئیں گے۔ جو یقیناً وحید اسدؔ کی پختگی کلام اور کثرتِ مطالعہ کی دلالت کرتے ہیں۔ وحید اسدؔ کے یہ اشعار آپ بھی دیکھئے:

ہوائے دردِ ہجراں چل پڑی ہے
مجھے خود میں بکھرنا پڑ گیا ہے

نئے انداز سے اُگ آؤں گا میں اس کی چاہت میں
مری چاہت کی مٹی میں ابھی اکسیر باقی ہے

دل کے جذبوں کا استعارہ ہے
یہ دسمبر کا بھیگتا سورج

میں جلا ڈالوں گا اپنے عشق کے دیوان کو
لفظ جب میری غزل کا ایک بھی بھاری ہوا

نوجوان شاعر وحید اسدؔ نے اپنی شاعری کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے کا بھی خاصا اہتمام کیا ہوا ہے۔ وہ عرصہ دراز سے ملک کے معروف ادبی جرائد و رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ اسی لیے وحید اسدؔ کا نام غیر معروف نہیں رہا۔ یوں بھی نوجوان نسل سے تعلق رکھنے والے بیشتر شعراء اُن کی قدر و منزلت کرتے ہیں اور مشاعرے میں تحت اللفظ سے ادائیگی کا ان کا اپنا انداز ہے جو متاثر کن ہے۔ محبت و اخلاص اس نوجوان کا طرۂ امتیاز ہے۔ بڑوں کی عزت و توقیر کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم عصر نوجوان شعراء کے علاوہ اساتذۂ فن بھی اس نوجوان کی حوصلہ افزائی کرتے دیکھے گئے ہیں۔

ہمارے نوجوان خوبصورت شاعر و ادیب جناب حسنؔ عباسی نے راؤ وحید اسد کو مجسم شاعری کے پیڑ کی شکل اختیار کرنے والا شاعر قرار دیا ہے۔ یقیناً اپنی ایم ای ایس کی خدمات میں ان کا یہ شعری پڑاؤ وقت کے ساتھ ساتھ برف کے ٹکڑوں سے گلیشیئر میں بدلنے کے عرصے تک تخیل، تصور اور تیقن کے کہساروں کا رُوپ رنگ اختیار کر چکا ہے۔ اُردو ادب کو نئے لکھاریوں کی رمزیہ شاعری کے علاوہ تخلیقی تجربات کی بھی ضرورت ہے۔ کئی مقامات پر راؤ وحید اسدؔ اس پر کامل

دسترس رکھنے والے شاعر دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ اشعار میری بات کی تائید کریں گے۔

عکس آیا کہاں تھا پانی میں
یونہی اُلجھا رہا کہانی میں

ہے اس سے ذرا آگے ''محبت کا جزیرہ''
پڑتا ہے جو رستے میں یہ کہسار مرے یار

لمحے محبتوں کے کوئی ساتھ لے گیا
کیا ڈھونڈتے ہو وقت کے پتھر کو توڑ کر

ساحر شفیق جو خود بھی اچھے شاعر اور ادیب ہیں بلکہ تنقید میں کما حقہ دسترس رکھتے ہیں۔ وحید اسد کی شاعری کے بارے میں درست فرماتے ہیں کہ ''وحید اسد نے نئی زمانہ غزل کے حبس نما ماحول میں فطرت کی طرف ایک دریچہ وا کیا ہے'' اورانہوں نے اس بارے میں ہماری صحیح رہنمائی کی ہے کہ آج کوئی بھی شخص جو اختیار رکھتا ہے بے اختیار زندگی کو موت سمجھتا ہے۔ حالانکہ ایک وقت وہ بھی ہوتا ہے جب انسان کے پاس اختیار نہیں ہوتا۔ اب ایسے لمحات میں کچھ لوگ روکر زندگی گزارتے ہیں۔ کچھ آہیں اور سسکیاں بھرتے ہیں۔ کچھ اس سے کمپرومائز کر لیتے ہیں۔ جبکہ راؤ وحید اسد جیسے نوجوان اس عرصے کو مثالی عرصہ قرار دیتے ہیں تاکہ آنے والی زندگی میں آنے والے لوگ مایوسی کے حصار میں نہ آئیں۔ یہ تخلیقی صلاحیت بہت کم ہم عصر شعراء میں نظر آتی ہے۔ سو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا آج کا یہ نوجوان شاعر بلاشبہ روشن امکانات کا حامل شاعر ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے استقامت مزید عطا کرے آمین۔ راؤ وحید اسد کے دو اشعار پیش کر کے اجازت چاہوں گا۔

نکلی ہمارے جسم کے خستہ مکاں سے اینٹ
پھر اس کے بعد جسم ہی سارا نکل پڑا
نکل ہی آئے ہیں ہم جانب صحرا تو ڈر کیسا
چلو کچھ دیر روتے ہیں چلو برسات کرتے ہیں

تھیا تھیا

عامر بن علی/ جاپان

کوئی دروازہ کھلتا ہے نیا
محسوس ہوتا ہے
دوبارہ اک نئی دنیا کا
لگتا ہے جہاں بدلا
کوئی جب پیار کرتا ہے
تو جھرنے پھوٹنے لگتے ہیں
روشن آبگینوں سے
سحر کے آئینے میں
عکس شبنم کا اترتا ہے
گلوں کا روپ لیکر
زندگی پہلو بدلتی ہے
کوئی جب پیار کرتا ہے
صباحت کے لبادے میں
کوئی کونپل نکلتی ہے
اُفق کے پار اک روپہلی جھانجھر رقص کرتی ہے
شفق کی چاشنی چنچل لبوں پر جھلملاتی ہے
کوئی جب پیار کرتا ہے
کوئی جب پیار کرتا ہے

صغرا صدف/ لاہور

نقصان تیرے دھیان میں اکثر ہوا مرا
ہاتھوں سے گر کے ٹوٹ گیا آئنہ مرا
وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ خوش ہوں میں اس کے ساتھ
واقف نہیں ہے درد سے درد آشنا مرا
میں پوچھ ہی نہ پائی تھی، کس حال میں ہے وہ
بے حال راستوں میں ملا ہم نوا مرا
میں اس کو ڈھونڈتی ہوں کہیں دل کے آس پاس
اور دل میں جھانکتا ہی نہیں بے وفا مرا
نکھرا کبھی جو حُسن مرا اس کی یاد میں
پھر آئنہ بھی کر نہ سکا سامنا مرا
بے دخل ہو چکا ہے جو دل کے دیار سے
دُنیا سمجھ رہی ہے اُسے آشنا مرا

ہما گل/ لاہور

کتنا مشکل ہے پیار کا دریا
اِک اکیلے کا پار کر لینا
کتنا دشوار ہے ہواؤں پر
بخت اپنا سوار کر لینا
غم کو سہنے کے شوق میں اپنی
روح کو تار تار کر لینا
گننے بیٹھو جو دن سزا کے میری
اُس میں راتیں شمار کر لینا
اُس کا ہر بار بات سے پھرنا
میرا پھر اعتبار کر لینا
میری عادت ہی بن گئی ہے ہما
یہ عمل اختیار کر لینا

ایک شاعر کے منتخب اشعار/ شاعر: حسن عباسی

انتخاب: صائمہ ملک

صائمہ ملک معروف شاعرہ ہیں۔ اُن کے دو شعری مجموعے ''تری پلکوں کے سائے میں'' اور ''پہلا گیت محبت کا'' شائع ہو چکے ہیں۔ ''ارژنگ'' میں ایک شاعر کے منتخب اشعار کے عنوان سے انھوں نے ایک سلسلے کا آغاز کیا ہے۔ ہر شمارے میں کسی معروف شاعر کے کلام سے وہ منتخب اشعار نذر قارئین کیا کریں گی۔ (ارژنگ)

ہم نے بھی محبت کی ہے (۱۹۹۹ء)

خموش رہ کر پکارتی ہے
وہ آنکھ کتنی شرارتی ہے

شرط اتنی ہے کہ بارش کی طرح آنا تم
دیکھنا کیسے میں شاخوں سے نکل آؤں گا

اِک شخص کی آواز پہ یوں دوڑ رہا ہوں
گر وقت بھی رُک جائے تو ٹھہرا نہیں جاتا

سمندروں کے مسافر تھے دربدر رہتے
تمہاری آنکھ نہ ہوتی تو ہم کدھر رہتے

جس موسم میں کوئی یاد بھی کیا آیا ہے
اتنا رویا ہوں کہ بارش کا مزا آیا ہے

اِک پھول محبت کا کھلا تھا مرے دل میں
اور اُس کا جھکاؤ کسی پتھر کی طرف تھا

بادلوں نے اکٹھے دیکھا ہمیں
اور پھر دیر تک برستے رہے

صحن کی تنہائی چگنے کے لیے
کچھ کبوتر اپنے گھر لے آؤں گا

جتنا کہ ہوا کھول کے آ جاتی ہے در کو
اتنا بھی کبھی اُس سے تو آیا نہیں جاتا

دُھوپ بہت تیکھی ہے میں نے لکھا تھا
اُس نے اپنے خط میں سایہ بھیجا ہے

کچھ رونے کی عادت مجھے ویسے بھی بہت تھی
اور گھر کا دریچہ بھی سمندر کی طرف تھا

ایک محبت کافی ہے (۲۰۰۵ء)

اُس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

تجھ کو رُخصت کروں کیسے کہ مرا دُکھ ہے یہی
پھر نہیں ملتا جو اِک بار جدا ہوتا ہے

میں بھی اس کے لیے بیٹھا رہا چھت پر شب بھر
وہ بھی مرے لیے مہتاب میں آیا ہوا تھا

پہلے کچھ دیر چراغوں میں نظر آتا ہے
پھر وہ چہرہ مری آنکھوں میں نظر آتا ہے

ایک لمحے کو جدا ہونے دے ممکن ہی نہیں
دھیان رکھتی ہے وہ مرا اپنے آنچل کی طرح

یادیں تھیں دفن ایسی کہ بعد از فروخت بھی
اُس گھر کی دیکھ بھال کو جانا پڑا مجھے

سورج کبھی تو مرے نشانے پہ آئے گا
پھر چاند کا دماغ ٹھکانے پہ آئے گا

کسی کی یاد بھی آ سکتی ہے دریچوں سے
ہلیں جو پردے تو اُس کو فقط ہوا نہ سمجھ

ایسے ایسے صدمے جھیلے ہیں میں نے
خود کو زندہ دیکھ کے حیرت ہوتی ہے

جب آئے وہ ساحل پہ کبھی گھر سے نکل کر
لہریں اُسے چھوتی ہیں سمندر سے نکل کر

عین ممکن ہے پلٹ آؤں میں
مجھ کو شانوں سے ہلایا جائے

ایک شرارت کرتے ہیں
آؤ محبت کرتے ہیں

ایک شام تمھارے جیسی ہو (۲۰۱۰ء)

اپنی دہلیز پہ کچھ دیر پڑا رہنے دے
جیسے ہی ہوش میں آؤں گا چلا جاؤں گا

میں نے پانی پر بنا رکھی ہیں تصویریں کئی
پھول جب تالاب میں گرتا ہے ڈر جاتا ہوں

اگر میں سانس لیتا ہوں یہاں پر
تو اُس کی پوری قیمت دے رہا ہوں

میں یوں خموشی سے مرنے والا کبھی نہیں تھا
کسی نے لفظوں کا زہر مجھ کو پلا دیا ہے

مجھ کو خالی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے
اُن کو جھوٹے خواب دکھاتا رہتا ہے

یوں لگتا ہے جیسے وہ لوٹ آیا ہے
یہ آواز تو بارش کی آواز نہیں

اُس کو ہجرت کا سبب کچھ تو بتا کر جاؤں
اپنی آنکھیں کسی کاغذ پہ بنا کر جاؤں

میں نے یہ جنگ نہیں چھیڑی یہاں اپنے لیے
تخت پہ تم کو بٹھاؤں گا چلا جاؤں گا

صرف تیری آنکھیں ہی کھینچتی نہیں ہم کو
یہ زمیں پکڑتی ہے آسماں بلاتے ہیں

دیکھ پایا نہیں چہرہ مرے ہاتھوں میں ترا
شاخ سے پھول رقابت میں نکل آیا ہے

صد شکر ہوئی مجھ سے ادا سنت یوسف
کھینچا ہے زلیخا نے کئی بار مجھے بھی

آج کی رات گزاروں گا مدینے میں حسن
صبح تلوار اُٹھاؤں گا، چلا جاؤں گا

کلامِ تازہ

حسن عباسی/ لاہور

پیڑوں کے کٹنے پر یوں کملایا ہوں
جیسے میں ان پیڑوں کا ماں جایا ہوں

دُشمن مجھ سے رقص میں جیت نہیں سکتا
میں سانپوں کے ساتھ بہت لہرایا ہوں

مجھ کو یہاں پر اور تو کوئی کام نہیں
میں دُنیا میں تم سے ملنے آیا ہوں

اتنی ہے محتاط وہ میرے بارے میں
جیسے میں ہی اُس کا کل سرمایہ ہوں

میرا پوچھنا ہے تو پوچھ محبت سے
جس کا روزِ ازل سے میں ہمسایہ ہوں

اپنی آنکھوں سے کہہ دو خاموش رہیں
آج میں تم سے جھگڑا کرنے آیا ہوں

میں پڑھوں گی تیری خاطر ایسی سورت دیکھنا
تجھ سے ملنے کی نکل آئے گی صورت دیکھنا

"محبت ایک وعدہ ہے"

شاعرہ: راشدہ اُداس

اہتمام: نستعلیق مطبوعات

غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور 0300-4489310

احسان اللہ ثاقب/ لاہور

یاد کے جزیرے میں پیڑ سبز رہتے ہیں　　دل میں جو بھی آیا ہے انقلاب تازہ ہے

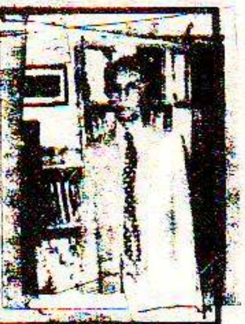

احسان اللہ ثاقب کی ہمہ جہت شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کو شاعر ادیب، صحافی، طلب علم، ریسرچ اسکالر اور ادب و مذہب سے وابستگی رکھنے والا ہر فرد جانتا ہے۔ ان کے اب تک چار شعری مجموعہ ہائے کلام ''شہر غزل''، ''محبت اور خوشبو''، ''برگ شیریں''، ''کاروانِ غزل'' شائع ہو چکے ہیں۔ احسان اللہ ثاقب نے اپنی محنت شاقہ، باریک بینی، عرق ریزی، عمیق مشاہدہ اور اعلیٰ تعلیمی قابلیت سے بھی فن شاعری کو کشید کیا ہے اور وراثت میں بھی یہ ہنرمندی ان کے حصے میں آئی ہے۔ فاخر ہریانوی احسان اللہ ثاقب کے والد بزرگ وار ہیں۔ ان کی تعلیم، پرورش اور تربیت سے آج احسان اللہ ثاقب فروغ تعلیم و ادب میں مگن ہیں اور اپنی زندگی اس کار خیر کے لیے وقف کر دی ہے۔ (شاعر علی شاعر)

صبح آوارگی شام آوارگی کس لیے
رات دن ہر قدم پر رہے تشنگی کس لیے
تشنہ لب ہی اگر دل نے رہنا تھا اس شہر میں
کاٹ دی میں نے سڑکوں پہ یہ زندگی کس لیے
کس کی خاطر جلائے ہیں میں نے دیے شہر میں
کر رہا ہوں زمانے میں اب روشنی کس لیے
کس لیے میں نے تم سے روابط بڑھائے یہاں
اور کی میں نے تم سے یہاں دوستی کس لیے
کس کی خاطر ہے روشن قمر آسماں پر بتا
چاند کو چاہیے رات بھر روشنی کس لیے
کام آنا زمانے کے انسانیت ہے فقط
آدمی ہے وگرنہ یہاں آدمی کس لیے
کس کی خاطر رواں ہیں مرے ساتھ الفاظ اب
کر رہا ہوں میں ثاقب یہاں شاعری کس لیے

غزل سنا کے غزل سن کے غزل گنگنا کے دیکھیں گے
دل و نگاہ میں اشعار کی خوشبو بسا کے دیکھیں گے
غم فراق غم زندگی آوارگی غم دُنیا
نہ جانے کتنے نئے رنگ دلِ مبتلا کے دیکھیں گے
ہوائیں تیز ہیں گستاخ ہیں دریا بھی ہے روانی میں
یہ بادبان ابھی اور کئی رُخ ہوا کے دیکھیں گے
نگاہ اس پری پیکر کے خدوخال پر نہیں جمتی
وہ کیا بلا ہے فسوں آفریں ہے پاس جا کے دیکھیں گے
تمام عمر کٹی دشت نوردی میں جن کی آوارہ
وہ لوگ اب کہاں ٹھہریں گے کہاں گھر بنا کے دیکھیں گے
خیال وخواب تھے جب تک اسے جا کر وہاں نہ دیکھا تھا
رہا ہے چاند میں اب کیا جو وہاں لوگ جا کے دیکھیں گے
پگھل رہا ہے کڑی دھوپ میں یہ موم سا بدن ثاقب
کمی ہے کتنی حرارت میں یہ سائے میں جا کے دیکھیں گے

سورج بدلتا نہیں کیوں
اب سایہ ڈھلتا نہیں کیوں
ہے جس دیے کی ضرورت
وہ آج جلتا نہیں کیوں
کوئے صنم میں بھی جا کر
دل اب سنبھلتا نہیں کیوں
ٹھہرا ہوا ہے جو منظر
وہ اب [illegible]تا نہیں کیوں
شب کیوں گزرتی نہیں ہے
دن اب نکلتا نہیں کیوں
جو ہے کڑا وقت سر پر
وہ وقت ٹلتا نہیں کیوں
دل اب بہاروں میں ثاقب
جانے مچلتا نہیں کیوں

اسیر وقت ہوں ماضی میں حال میں گم ہوں
گزرتے لمحوں نئے ماہ و سال میں گم ہوں
بساط کیا ہے سمندر میں ایک قطرے کی
میں کائنات کے حسن و جمال میں گم ہوں
اِک آئنے میں مقید ہوں ایک مدت سے
میں اپنے بکھرے ہوئے خدوخال میں گم ہوں
میں شرق وغرب کے حیرت کدے میں آوارہ
کبھی جنوب میں حیراں شمال میں گم ہوں
مری حیات میں شامل ہیں روز و شب ایسے
کبھی خوش کبھی حزن و ملال میں گم ہوں
یہ کائنات ہے ثاقب مری متاعِ جاں
کسی کے پیار کے ہجر و وصال میں گم ہوں

اعزاز احمد آذر / لاہور

فقط ایک لمحہ گرفت میں نہیں آ سکا　　مری ٹھوکروں میں رہا جہاں، میرے مہرباں

اعزاز احمد آذر کا شمار ے ہمارے عہد کے نامور شعراء میں ہوتا ہے۔ اُردو کی طرح ان کا پنجابی کلام بھی بہت مقبول ہے۔ صحافت اور کمپیئرنگ میں بھی اُنھوں نے اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اُن کی شاعری غم جاناں اور غم دوراں کا حسین امتزاج ہے۔ ایک طرف تو اُن کی نظمیں اور غزلیں نوجوان نسل میں مقبول ہیں اور دوسری طرف اہل علم بھی اُن کی منفرد شاعری کے معترف ہیں۔ اعزاز احمد آذر کی شاعری میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو کہ اچھی شاعری کا خاصا ہوتی ہیں۔ وہ مشاعرے کے بھرپور شاعر ہیں۔ دلفریب کلام اور منفرد انداز سے مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔ کئی ٹی وی پروگرامز کے میزبان رہے ہیں۔ بہت سے بین الاقوامی مشاعروں اور کانفرنسوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ اُن کی شاعری عصر حاضر کی نمائندہ شاعری ہے۔ (ارژنگ)

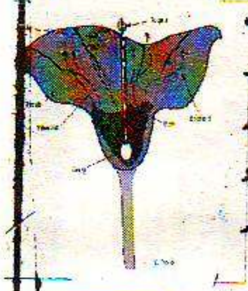

شام کی دہلیز سے شمعیں اُٹھا کر لے گیا
کون ہے جو شہر کی رسمیں چرا کر لے گیا
شہر میں تقسیم دستاروں کی تھی کل ہر طرف
یہ کیا میں نے کہ اپنا سر بچا کر لے گیا
ایک قطرے کے لیے اُترا تھا اُونچی ڈال سے
پانیوں کا زور پنچھی کو بہا کر لے گیا
لوگ پاگل ہو رہے تھے بارشوں کی چاہ میں
اور جھونکا بادلوں ہی کو اُڑا کر لے گیا
وہ، نمائش گاہ میں لائے تھے ایجادات نو
میں قلم کی نوک پر قطرہ سجا کر لے گیا
ہم تو اُٹھ آئے تھے اُس کی بزم سے آذر مگر
پھر دل کم بخت باتوں میں لگا کر لے گیا

زینہ شام سے اُتر آیا
چاند چپکے سے میرے گھر آیا
آج وہ کم نما تھا جلوہ فگن
میں بھی ایمان تازہ کر آیا
باخبر دوستوں کی محفل سے
جو بھی آیا وہ بے خبر آیا
پھر پلٹ کر نہ اس طرف دیکھا
میں کہ جس راہ سے گزر آیا

بے وفائی تو اس کا شیوہ تھا
اور الزام میرے سر آیا
تیری محفل سے جو بھی اُٹھ کے گیا
تیری محفل میں لوٹ کر آیا
پھر ہے درپیش امتحاں آذر
پھر وہ مہتاب بام پر آیا

حد امکاں سے بہت آگے نکل کر سوچنا
ایک قطرے کی طلب ہو تو سمندر سوچنا
موسموں کا لطف اُلٹی گردشیں سب کھا گئیں
اب زمیں کے واسطے اِک اور محور سوچنا
خود بجھانا طاق میں رکھے دیے کو اور پھر
گھر کی دیواروں پہ لرزاں سائے کا ڈر سوچنا
ایک لمحے کے لیے رُکنا سرِ شام خیال
صبح امکاں کے لیے پھر زندگی بھر سوچنا
پیار بھی کرنا زمانے سے بھی گھبرانا سدا
آئینوں کا گھر بنانا اور پتھر سوچنا
کیا گزرتی ہے بھری دنیا میں تنہا شخص پر
ایک لمحے کے لیے خود سے بچھڑ کر سوچنا
جب کبھی اس سمت سے گزرو نئے ساتھی کے ساتھ
کیوں تمھیں مانوس سے لگتے ہیں منظر، سوچنا

وہ نہیں، تو یاد میں اس کی، غزل بھی کس لیے
کام تو مشکل ہے لیکن پھر بھی آذر سوچنا

مری زندگی ہے دھواں دھواں، میرے مہرباں
تو چلا گیا ہے مگر کہاں، میرے مہرباں
میں تری تلاش میں دائروں کے سفر میں تھا
کٹی عمر ایسے ہی رائیگاں، میرے مہرباں
تو بھی جانتا ہے جو تذکرے سے ہیں شہر میں
میں بھی سن رہا ہوں کہانیاں، میرے مہرباں
فقط ایک لمحہ گرفت میں نہیں آ سکا
مری ٹھوکروں میں رہا جہاں میرے مہرباں
مجھے علم ہے تجھے شہرتوں کا جنون تھا
ہے گلی گلی تری داستاں، میرے مہرباں
یہ کسی زمانے میں اِک بگولا ہوا کا تھا
یہ جو سر پہ میرے ہے آسماں، میرے مہرباں
یہ جو مجھ میں تجھ میں ہیں دوریاں، یہ ہیں کس لیے
کوئی بات بھی تو ہو درمیاں میرے مہرباں
میں بیاں کروں جو منادِ خلق کا ڈر نہ ہو
ہیں جو بے شمار کہانیاں، میرے مہرباں

یاسمین حبیب / برطانیہ

سو گئی ایک امربیل لپٹ کر ہم سے
ہم بہاراں میں بھی ویران ہوئے ہیں کیا کیا

''آسیب سے پرچھائیں تک'' اور ''تنکوں کا دوپٹہ'' کے بعد یاسمین حبیب کا تیسرا شعری مجموعہ ''کاجلوں کی لکیر'' پیش نظر ہے اور ایک صاحب طرز تخلیق کار کے لائق قدر و منزلت ادبی ارتقا کی تصدیق کر رہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے اُردو شعری منظر نامے سے الگ دُنیا میں تارکین وطن کی تازہ بستیوں میں مقیم جن شاعرات نے اپنی ادبی شناخت کو مستحکم کیا ہے ان میں یاسمین حبیب کا نام ایک بڑی شاعرہ کے طور پر سامنے آتا ہے۔ دنیا کے تمام شاعر چاہے وہ کسی زبان میں لکھ رہے ہوں، کسی زمانے میں لکھ رہے ہوں، کہیں بھی رہ رہے ہوں سب خیر اور محبت پر اپنے ایمان و یقین کی گواہی اپنے لفظ سے دیتے رہتے ہیں۔ یاسمین خوش نصیب ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے درد کی دولت سے ثروت مند رکھا اور انھیں جمالیاتی تقاضوں کے ساتھ اس واردات کو شعر بنانے کا سلیقہ بھی میسر آیا۔ اپنے تخلیقی وجود کے دونوں سرچشموں سے سیراب ہونے کے عمل نے یاسمین کی شاعری کو ایک نیا ذائقہ، ایک نئی جہت اور ایک نیا رنگ عطا کیا ہے جس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔ (افتخار عارف)

لمس تشنہ لبی سے گزری ہے
رات کس جاں کنی سے گزری ہے

اس مرصع نگار خانے میں
آنکھ بے منظری سے گزری ہے

ایک سایہ سا پھڑپھڑاتا ہے
کوئی شے روشنی سے گزری ہے

لوٹنے والے ساتھ ساتھ رہے
زندگی سادگی سے گزری ہے

کچھ دکھائی نہیں دیا، شاید
عمر اندھی گلی سے گزری ہے

شام آتی تھی دن گزرنے پر
کیا ہوا کیوں ابھی سے گزری ہے

کتنی ہنگامہ خیزیاں لے کر
اِک صدا خامشی سے گزری ہے

آنکھ بینائی کے تعاقب میں
کیسی لاحاصلی سے گزری ہے

ایک تنکا ہی سہی گو میں سمندر کے لیے
ڈوب کیوں جاؤں اُبھرتے ہوئے منظر کے لیے

اشک پر بیت گئیں چشم صدف میں صدیاں
قطرۂ خوں کوئی درکار ہے گوہر کے لیے

یونہی انبار خیالوں کے اُٹھا رکھے ہیں
چاہئے بوجھ کوئی اور، مرے سر کے لیے

کرتی رہتی ہوں میں اِک ساتھ سفر روز کئی
راستے ڈھونڈتی رہتی ہوں فقط گھر کے لیے

نیند رُوٹھے ہوئے محبوب کی صورت مجھ کو
آ تو جاتی ہے مگر صرف گھڑی بھر کے لیے

سنگ زن ہو، کہو، الزام بھری دنیا سے
سر سجا رکھا ہے میں نے نئے پتھر کے لیے

کہیں آواز ہوا کی، کہیں پھولوں کی زباں
گونج خوشبو کی کہیں، شامِ معطر کے لیے

گرمیوں کی کسی دوپہر کا جلتا لمحہ
ایک صندوق میں رکھا ہے دسمبر کے لیے

یہ بزمِ ناز کیوں دے دی ہے تم نے
نئی پرواز کیوں دے دی ہے تم نے

ہم اپنے آپ میں کتنے مگن تھے
ہمیں آواز کیوں دے دی ہے تم نے

ہمارے درمیاں کچھ بھی نہیں تھا
شب ہمراز کیوں دے دی ہے تم نے

سفر کے بعد آ جاتی تھی منزل
سرِ آغاز کیوں دے دی ہے تم نے

پروں کو باندھ کر سنگِ قفس سے
رگِ پرواز کیوں دے دی ہے تم نے

ہوائے غم کی کومل اُنگلیوں کو
صدائے ساز کیوں دے دی ہے تم نے

نگاہِ سادہ کو تحریک اتنی
غلط انداز کیوں دے دی ہے تم نے

جی چاہتا ہے میرا، باتیں کروں کسی سے
دل کی کہوں کسی سے، دل کی سنوں کسی سے

چلتے ہوئے کسی سے، موسم کا حال پوچھوں
گھر سے نکل کے باہر، یوں ہی ملوں کسی سے

دانستہ بھول جاؤں اپنا ہر اِک حوالہ
میں کون ہوں، کہاں ہوں پوچھا کروں کسی سے

رستے پہ چلتے چلتے خود ہی پلٹ گئی ہوں
اب کیا کہوں کسی سے، اب کیا کہوں کسی سے

ڈاکٹر کوثر محمود / راولپنڈی

اب ذرا تفصیل سے اے قاصد خوش رو بتا　　　اُس نے پہلے کیا کہا، پھر کیا کہا، پھر کیا کہا

ڈاکٹر کوثر محمود نہایت منفرد اور باکمال شاعر ہیں۔ وہ 80ء کی دہائی کے بعد آنے والے اُن معدودے چند نظم گو شاعروں میں ہیں جنہوں نے اُردو نظم کو لطافت اور کوملتا سے ہمکنار کیا۔ اُن کی غزل کی تہہ در تہہ معنویت کے اہل علم و ادب ہی نہیں نقاد بھی معترف ہیں۔ ڈاکٹر کوثر محمود آج کل کے شاعروں کی طرح خودنمائی اور Self Projection کی دوڑ میں شامل نہیں بلکہ وہ درویش منش شاعر ہیں۔ مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتے ہیں اور جب کبھی شریک ہوتے ہیں مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر کوثر محمود کی خوبصورت اور دل پذیر شاعری ہی اُن کا اصل تعارف ہے۔ وہ جدید شاعری کے نہایت معتبر شاعر ہیں۔ (ارژنگ)

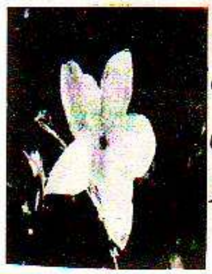

صبح بخیر!

ایک کرن نے کھولی آنکھ
اور تتلی نے لی انگڑائی
کلی کلی نے شبنم کے آویزے پہنے
قوسِ قزح مسکائی
صبح جمال کی پہلی ساعت
مجھ سے ملنے آئی

بہت پہلے!

بہت پہلے یہ لکھا جا چکا
تم کب، کہاں اور کیسے لوگوں میں جنم لوگے
تمہیں کس کس سے کتنی دیر ملنا ہے یہ سب طے ہے
تو پھر شکوہ اضافی ہے
ہمیں یہ لمحۂ موجود کافی ہے

تتلیاں پر کھولتی ہیں

بنفشی پھول پر اِک سرخ بوہٹی چل رہی ہے
روشنی بارش کے قطروں سے گزر کر
سات رنگوں کی دھنک میں ڈھل رہی ہے
اور مرا سورج
کسی آئینہ خانے میں ذرا سا مسکراتا ہے
کہیں امواجِ زرّیں پر مہکتا سا کوئی سندیس آتا ہے
خوشی سے کوئلیں پھر بولتی ہیں
اور ملائم دھوپ میں کھلتی تمازت جذب کرنے کے لیے
آہستگی سے
تتلیاں پر کھولتی ہیں

وزیری میرے بھائی

وزیری میرے بھائی!
تیرا نوحہ آنے والے کل پہ رکھتا ہوں
ابھی تو ان گنت کڑیل جواں
اپنی روایت پر فدا ہوں گے
کئی ایثار پیشہ لڑکیوں کی مانگ اُجڑے گی
خمیدہ پشت بوڑھے، پھول سے بچے
زمیں کا رزق ہوں گے
اور نہ جانے کتنی مائیں خشک آنکھوں سے
برستی آگ میں اپنے جگر گوشوں کے لاشے سامنے رکھے
قبیلے کے بڑوں کی راہ دیکھیں گے
خیابانِ تماشا میں عجب اِک شور برپا ہے
بزورِ عشوہ غمزہ، بدیسی مال جبراً بکتے ہیں
اور مرا دستِ ہنر بیکار ٹھہرا ہے
زر اندوزی کی ہاہا کار میں کچھ سوچنا دشوار ٹھہرا ہے
میرے بھائی!
زمینوں کی تجارت اب بھلا کیا گُل کھلائے گی
کہ اب تو دور بیٹھے تاجروں نے بھاؤ کھولا ہے
محافظ ہیں کہ لمبی تان کر سوئے پڑے ہیں
خطِ افلاس کے نیچے کا منظر دیکھتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے
عجب اِک ہو کا عالم ہے
وزیری میرے بھائی!
تیرا نوحہ آنے والے کل پہ رکھتا ہوں

کون تھی وہ

کون تھی وہ؟
معلوم نہیں
پر اِک انجان کشش تھی اُس میں
جیسے دور سلگتے صندل کی برفیلی آگ
جیسے ایک رِشی کے چہرے پر کھلتا ہو جوگ تیاگ
جیسے برہا کی شبنم میں بھیگا
تیور سر کا راگ!
کون تھی وہ؟...... معلوم نہیں
کون تھی وہ؟...... معلوم نہیں
پر اُس کے بھرے بھرائے بدن میں جنموں کا تھا ایک گداز
اور نہ جانے کتنے زمانوں پر پھیلی تھی
اُس کی نرم خرام آواز
اُس کے ماتھے کی بندیا میں سمٹی ہوئی تھی
قطبی ستارے کی جھلمل
اُس کے بائیں کاندھے پر تھا ایک گلابی تل!
کون تھی وہ؟...... معلوم نہیں

محمد مسعود احمد / اوکاڑہ

یہ کلیہ قاعدہ ہم عشق میں تسلیم کرتے ہیں محبت ضرب کھاتی ہے اگر تقسیم کرتے ہیں

مسعود احمد حبیب بنک اوکاڑا کینٹ برانچ کے منیجر ہیں۔غزل اور نظم میں ان کی تخلیقات ادب کے اعلیٰ معیار کو چھوتی نظر آتی ہیں۔ اب تک اُن کے تین شعری مجموعے علمی ادبی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی سمیٹ چکے ہیں۔احمد ندیم قاسمی انہیں جدید تر لہجے کا منفرد شاعر گردانتے ہیں جبکہ ظفر اقبال انہیں اوکاڑا میں اپنا ادبی وارث کہتے ہیں۔ادبی تقاریب میں احباب اُن کی شاعری سننے کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔انہوں نے نئے قوافی اور ردیفوں میں خوبصورت غزلیات کہنے کے ساتھ ساتھ پامال زمینوں کو بھی منفرد انداز میں استعمال کر کے انہیں نیا بنا دیا ہے۔وہ بات کو نئے انداز سے کہنے کا فن جانتے ہیں۔اُن کی شاعری اُردو ادب کا قیمتی اثاثہ ہے۔تمہارا عکس روشنی ہے، محبت روگ ہے جاناں اور سمندر آنکھ سے گہرا نہیں ہے۔اُن کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

آنکھ میں پھیلے کاجل کی مجبوری سمجھا کر
اے دل پہلے بات ہماری پوری سمجھا کر
قربت کا مفہوم یہی ہے دوسرے لفظوں میں
بال برابر دُوری کو بھی دُوری سمجھا کر
مفت میں مت بیکار سمجھ ہم فارغ لوگوں کو
سانسوں کی ترسیل کو بھی ضروری سمجھا کر
دلچسپی ہے اس کو غیر ضروری باتوں میں
تو بھی اپنے آپ کو غیرضروری سمجھا کر
دیکھ کے بھی دانستہ ہم نے کچھ نہیں دیکھا پھر
دیکھنے والی آنکھوں کی بے نوری سمجھا کر
پھولوں سی مسکان ہے جس کے کومل ہونٹوں پر
اُس کے لمس کی خوشبو کو کستوری سمجھا کر
جیسے تیسے بھی گزرے مسعودؔ غنیمت ہے
روکھی سوکھی کو بھی گھی کی چوری سمجھا کر

جنازے کو زیادہ دیر گھر رکھا نہیں جاتا
تبھی تو مجھ سے ان کاندھوں پہ سر رکھا نہیں جاتا
ہمارا کام تو سوکھی جڑوں کو خون دینا ہے
ہمارے واسطے کوئی ثمر رکھا نہیں جاتا
روایت وہ کہاں گھر میں بڑے بوڑھوں کو رکھنے کی
پرانا ہو تو آنگن میں شجر رکھا نہیں جاتا
بھلا کب ہر کس و ناکس کی اس دن تک رسائی ہے
سبھی کے سامنے دل کھول کر رکھا نہیں جاتا
ہوا کے سامنے سینہ سپر ہم لوگ ہیں ورنہ
چراغوں کو ہوا کے دوش پر رکھا نہیں جاتا
خدا جب رزق دے دیتا ہے پتھر میں بھی کیڑے کو
تو ہم سے ساتھ میں رختِ سفر رکھا نہیں جاتا
اُسے اس شہر میں رہنے کا کوئی حق نہیں جس سے
گلے کو خشک اور آنکھوں کو تر رکھا نہیں جاتا
سمندر کی قسم ساری زمیں بے آب ہو جاتی
ہماری آنکھ میں پانی اگر رکھا نہیں جاتا
قبیلے کا قبیلہ مرتکب کوتاہ بینی کا
ہمارے ساتھ کوئی دیدہ ور رکھا نہیں جاتا
تو اس دیوار نے پھر ریت کی دیوار ہونا ہے
اگر دیوار میں کوئی بھی در رکھا نہیں جاتا

یہ کلیہ قاعدہ ہم عشق میں تسلیم کرتے ہیں
محبت ضرب کھاتی ہے اگر تقسیم کرتے ہیں
نکلنے کو بہت اُوپر نکل سکتے تو ہیں لیکن
شجر اس بوڑھے برگد کی بڑی تعظیم کرتے ہیں
کوئی قارون کی دولت نہیں جو خرچ ہو جائے
ہم اپنے نام تیرے ہجر کی اقلیم کرتے ہیں
ستارے ہی ستارے جگمگا اُٹھتے ہیں رستے میں
لہو کی لو سے جب ہم روشنی تجسیم کرتے ہیں
جدائی جان لیوا ہے مگر کارِ محبت میں
تری خاطر ہم اپنے آپ کو دو نیم کرتے ہیں
خدا کی حمد میں مصروف یہ ننھے پرندے بھی
محمدؐ مصطفٰی کے دین کی تفہیم کرتے ہیں
یہی اِک راستہ دار و رسن سے ہو کے آتا ہے
صراطِ عشق میں ہم کون سی ترمیم کرتے ہیں

رستہ کوئی دیوار میں ہو در کے علاوہ
جاؤں گا کدھر بھاگ کے اس گھر کے علاوہ
ہاتھوں میں تھا جو کچھ بھی گیا میل کی صورت
پاؤں میں پڑا کچھ بھی نہیں سر کے علاوہ
سائے کی طرح ساتھ مرے رختِ سفر میں
آسیب کوئی اور بھی ہے ڈر کے علاوہ
پگھلایا جسے دل نے بہت موم کی صورت
کچھ بھی تو نہیں نکلا ہے پتھر کے علاوہ
اس جنگ میں ہارا ہوں جہاں میرے مقابل
کوئی بھی نہیں تھا مرے لشکر کے علاوہ
کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی
ہے شور کہاں یہ مرے اندر کے علاوہ
اِک خوفِ بلاخیز ہے یہ سیل رواں بھی
میں آنکھ سے ڈرتا ہوں سمندر کے علاوہ
مسعود اسی نے تو مجھے دھوکا دیا ہے
سب کچھ تھا مرے پاس مقدر کے علاوہ

نرجس افروز زیدی / کراچی

تم نہیں ہو، مگر نہیں، تم ہو — یہ جو سایا شجر کیے ہوئے ہے

نرجس افروز زیدی کی شاعری اپنے منفرد اسلوب کے باعث نہایت معتبر ہے۔ وہ شہرت اور نمود و نمائش کی دُنیا سے الگ تھلگ گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر ایسے ایسے فن پارے تخلیق کر رہی ہیں جن پر دل داد کے ساتھ شاعرہ کو دُعا بھی دیتا ہے۔ نرجس افروز زیدی کی شاعری سنجیدہ ادبی حلقوں میں اپنی توجہ حاصل کر چکی ہے اور آج کی غزل کا تذکرہ ان کے نام کے بغیر نامکمل ہے۔ ہمارے عہد کی شاعرات کی شاعری میں اس قدر بے ساختگی، پختگی اور شگفتگی کی مثال کم کم نظر آتی ہے۔ ربِ سخن نے اُن کو شاعری کی فطری صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے۔ اُن کا جہانِ سخن نرالا اور انوکھا ہے جس میں داخل ہونے کے بعد حیرت کے در وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ (حسن عباسی)

ترے خیال، ترے خواب، تیرے نام کے ساتھ
بنی ہے خاک مری کتنے اہتمام کے ساتھ
بہت سے پھول تھے اور سارے اچھے رنگوں کے
صبا نے بھیجے تھے کل جو ترے پیام کے ساتھ
نظر ٹھہرتی نہ تھی اُس پہ ، اور خود پر بھی
میں آئنے میں تھی کل ایک لالہ فام کے ساتھ
ترے خیال سے روشن ہے سرزمینِ سخن
کہ جیسے زینتِ شب ہو مہِ تمام کے ساتھ
سُنا ہے پھول جھڑے تھے جہاں ترے لب سے
وہاں بہار اُترتی ہے روز شام کے ساتھ
پھر آ گئی ہے مرے در پہ کیا وہی دنیا؟
میں کر کے آئی تھی رُخصت جسے سلام کے ساتھ
خوشی کے واسطے کب کوئی دن مقرر تھا
مگر یہ دل میں رُکی ہے ترے خرام کے ساتھ

مجھے یقین دِلا یا مرے گماں سے نکل
مرا نہیں ہے تو جا، میری داستاں سے نکل
یہاں درست ہے کیا اور کیا درست نہیں
اُلجھ نہ بھول بھلیوں میں اِس جہاں سے نکل
میں ڈھل نہ جاؤں کہیں اس چراغ کی لو میں
شبِ فراق دیئے کو بجھا ، یہاں سے نکل
تُو اب کے اپنے خدوخال خود تراش کے دیکھ
اِس آئنے میں بنے عکسِ رائیگاں سے نکل
میں آئے دن کے تذبذب میں جی نہیں سکتی
مرے سخن میں سما، یا مرے بیاں سے نکل
سُنا ہے مہر و خلوص و وفا کا شہر ہے یہ
اگر یہ سچ ہے تو اِس شہرِ بے اماں سے نکل
میں چاہتی ہوں بلا واسطہ اُسے ملنا
سوائے جہان! مرے اُس کے درمیاں سے نکل

میں چاہتی ہوں کہ عمرِ رواں پلٹ جائے
کسی یقین کی جانب گماں پلٹ جائے
میں لوحِ کُن پہ ترا نام لِکھ کے آ جاؤں
اگر کہیں جو کبھی آسماں پلٹ جائے
میں اُلٹے پیروں چلوں اور یہ گمان کروں
کہ تیری سمت کو پھر یہ جہاں پلٹ جائے
میں ڈر رہی ہوں مجھے بولنا پڑا تو کہیں
نہ میری آہ سے یہ خاکداں پلٹ جائے
میں جتنے روز جیوں اُس سے گفتگو کر لوں
پھر اِس کے بعد مرا خوش زباں پلٹ جائے
یہ راہ بھول کے آئی ہوئی چمن میں بہار
جہاں کی ہے اِسے کہہ دو وہاں پلٹ جائے
ہوائے گردشِ لیل و نہار ایسی چلے
ورق کی طرح مری داستاں پلٹ جائے

میرے دل میں تُو گھر کیے ہوئے ہے
زیست کو معتبر کیے ہوئے ہے
اس زمانے میں تُو بھی ہے، یہ بات
مجھ کو آسودہ تر کیے ہوئے ہے
آسماں پر ہے اور آج کا چاند
روشنی خاک پر کیے ہوئے ہے
تیرے چہرے پہ دھیمی دھیمی ہنسی
میرا غم مختصر کیے ہوئے ہے
اے محبت تُو کون ہے؟ کہ جو یوں
دل کو زیر و زبر کیے ہوئے ہے
تم نہیں ہو ، مگر نہیں ، تم ہو
یہ جو سایا شجر کیے ہوئے ہے
کیا تصور ہے جو زمینِ سخن
آج کل بارور کیے ہوئے ہے

جہانِ کُن سے کوئی تو صدا سُنائی دے
نہیں ہے جب تجھے مِلنا تو پھر جدائی دے
میں کب تلک تجھے آخر خیال میں لاؤں
تُو اپنی شکل میں اِک بار تو دِکھائی دے
میں تجھ سے ملنے کسی روز بھی چلی آؤں
اِس آب و گِل کے قفس سے تو وہ رہائی دے
مِلا ہے عکس میں میرے ، ضرور عکس ترا
یہ آئنہ جو مجھے خوش نما دِکھائی دے
نہیں ہے اِتنا سبک سر کہ دل محبت میں
تجھے پکارے ، ترا نام لے ، دُہائی دے
کہاں تلک میں وضاحت کروں محبت کی
کہاں تلک یہ دلِ بے گنہ صفائی دے

محمد مختار علی / جدہ (سعودی عرب)

خواہشوں کے حسیں تصادم میں   میں کئی مرتبہ ہلاک ہوا

محمد مختار علی کا تعلق اولیاء کی سرزمین ملتان سے ہے۔ ۱۲سال سے سعودی عرب کے شہر جدہ میں مقیم ہیں۔ تین شعری مجموعے ''کتاب آئندہ'' ۱۹۹۶ء ''کمیاب'' ۲۰۰۳ء اور قرض ہنر ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئے۔ ۱۹۹۳ء میں بی بی سی لندن کے عالمی مقابلوں میں دُنیا کے دس بہترین نوجوان شعراء میں انتخاب ہوا۔ جدہ کے دو بین الاقوامی مشاعروں میں شرکت بھی کر چکے ہیں۔ شاعری کے تمام قواعد و رموز سے آشنا ہیں اور جذبوں کے بھرپور اظہار کا سلیقہ جانتے ہیں۔ اُن کے مصرعے مکمل اور شعر توانا ہوتے ہیں۔ محمد مختار علی کی غزل جدت اور کلاسیکی روایت کی آئینہ دار ہے۔ (ارژنگ)

آسماں یا زمیں طواف کرے
جو جہاں ہے وہیں طواف کرے

کعبۂ عشق بے نیاز سہی
دل تو اپنے تئیں طواف کرے

رنگ اُس کا طواف کرتے ہیں
جب کوئی مہ جبیں طواف کرے

طائر خوش نوا ہو نغمہ سرا،
اور حرم کا مکیں طواف کرے

اُس گماں سے ہمیں ہے نسبتِ عشق
جس گماں کا یقیں، طواف کرے

ریت چھلکائے زمزمے مختار
جب وہ صحرا نشیں طواف کرے

آواز سلامت ہے نہ سازینہ ہمارا
اب کون سنے نغمۂ پارینہ ہمارا

سہہ جاتا ہے دل چوٹ خوشی کی ہو کہ غم کی
پتھر کی طرح سخت ہے آئینہ ہمارا

اخلاص جو برتا تو برا مان گئے ہیں
کرتے تھے گوارا جو کبھی کینہ ہمارا

وحشت ہو، اذیت ہو، دھما کہ ہو، الم ہو!
اِک حشر پہ موقوف ہے اب جینا ہمارا

بے قامت و قد مند شہرت نہیں ملتی
یاروں نے بھی قامت و قد چھینا ہمارا

بڑھ جاتے ہیں غم اور بھی راحت طلبی میں
ہر آن بگڑ جاتا ہے تخمینہ ہمارا

مختار جسے ذوقِ لطافت ہو وہ لے جائے
پر ہے سخن گرم سے گنجینہ ہمارا

افسانے سے بڑھ کر ہے حقیقت سے زیادہ
کچھ بھی نہیں دنیا میں محبت سے زیادہ

اب کرب ہے آنکھوں میں بصارت سے زیادہ
اب اشک ہے آئینوں میں حیرت سے زیادہ

خود سے جو ملاقات ادھوری ہے وہ کر لیں
کچھ وقت میسر ہو جو فرصت سے زیادہ

اب کوئی ضرورت ہے، نہ تم پاس ہو میرے
تم تھے تو سبھی کچھ تھا ضرورت سے زیادہ

یہ کارِ محبت ہے ذرا ٹھہریے صاحب!
ہر کام کو مت کیجیے عجلت سے زیادہ

شہرت کبھی معیار سے بڑھ کر نہیں ہوتی
بولی کہیں لگ جاتی ہے قیمت سے زیادہ

کیا کم ہے کہ اُس در سے بھی ہم کچھ نہیں لائے
ملتا ہے جہاں ظرف کی وسعت سے زیادہ

انساں ہیں، اگر بے سر و ساماں ہیں تو کیا ہے؟
مت دیکھیے صاحب ہمیں نفرت سے زیادہ

اِک عشق ضروری ہے کہ مختار یہ جیون
کچھ بھی نہیں اِک عشق کی مہلت سے زیادہ

چاند کی دُھن میں ستارہ کوئی کب دیکھتا ہے
عشق میں جاں کا خسارہ کوئی کب دیکھتا ہے

دیکھتے ہیں سبھی حیرت سے سمندر کی طرف
اشکِ بے رنگ ہمارا کوئی کب دیکھتا ہے

آئینے سے تو سبھی بات کیا کرتے ہیں
آئینے کو سخت آرا کوئی کب دیکھتا ہے

کیوں نظارے مری آنکھوں کی تمنا نہ کریں
میری آنکھوں سے نظارا کوئی کب دیکھتا ہے

عشق میں درد کی شدت کا الگ ہے معیار
ڈوبتا ہو تو کنارا کوئی کب دیکھتا ہے

دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں آنکھیں اُس سمت
اس کشش میں کہ دوبارا کوئی کب دیکھتا ہے

خاک اُڑانے کا تماشا ہے فقط بر سرِ خاک
سنگریزے ہوں کہ تارا، کوئی کب دیکھتا ہے

سب کو گردش نظر آتی ہے زمیں کی مختار
وقت کے ہاتھ میں پارہ کوئی کب دیکھتا ہے

سیّد نوید حیدر ہاشمی / کوئٹہ

پروں سمیت جہاں فاختائیں کٹتی ہیں   وہاں پہ پھول اُگاتے ہیں زندگی اور میں

بلوچستان کی تاریخ پر مبنی ان کی کتاب ''بلوچستان عالمی قوتوں کے نرغے میں'' کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔نوید حیدر ہاشمی کی شاعری کی پہلی کتاب ''دھوپ کا جنگل'' کے نام سے 1998ء میں شائع ہوئی۔جبکہ شاعری کی دوسری کتاب ''چلو جی بھر کے روتے ہیں'' 2006ء میں منظر عام پر آئی۔جبکہ ان کے کالموں پر مشتمل کتاب ''مکالمہ'' مذہبی شاعری کا مجموعہ ''دُعائے بتول'' اور ادبی انٹرویوز کی کتاب ''آمنے سامنے'' اور شاعری کی تیسری کتاب ''زندگی اور میں'' حال ہی میں شائع ہوئی ہیں ''حرف'' کوئٹہ رائٹرز فورم (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام اور سید نوید حیدر ہاشمی کی ادارت میں سرزمین بلوچستان سے شائع ہونے والا وہ پہلا عالمی ادبی میگزین ہے۔نوید حیدر ہاشمی دُبئی اور دوحہ قطر میں ادبی حوالے سے پاکستان کی نمائندگی بھی کر چکے ہیں۔نوید حیدر ہاشمی نے صوبہ بلوچستان میں ادب وثقافت کی ترویج وترقی کے لیے غیر معمولی خدمات سرانجام دی ہیں اور یہاں کی ادبی زندگی میں ایک ارتعاش پیدا کیا ہے۔انہوں نے اس مقصد کے لیے دن رات کام کیا ہے۔ان کی ادبی وثقافتی خدمات کے اعتراف میں گورنر بلوچستان نواب ذوالفقار علی مگسی نے انہیں صوبائی ایکسیلینس ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔بلوچستان میں امن وامان کی انتہائی تشویش ناک صورت حال میں بھی نوید حیدر ہاشمی نے قومی سطح کی ادبی وثقافتی تقاریب منعقد کروائی ہیں جو ان کی ادب وثقافت سے گہری وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔(ارژنگ)

تماشہ گاہ میں کرتب دکھانے والا ہوں
میں سب کے سامنے خود کو جلانے والا ہوں

کہانی میں مرا کردار ختم ہو رہا ہے
میں اس لیے پس منظر میں جانے والا ہوں

دُعا کے پانی سے گوندھی گئی ہے یہ مٹی
میں اس سے ایک پرندہ بنانے والا ہوں

شب فغاں میں مؤذن اذان دے رہا ہے
میں اس ہجوم کی آنکھوں میں آنے والا ہوں

مجھے تو آبِ رواں سے کلام کرنے دے
میں اس میں اپنے عریضے بہانے والا ہوں

یہ ہاتھ خاک پہ یونہی نہیں رکھے میں نے
میں اس زمین کو حرکت میں لانے والا ہوں

ہوائیں چلنے لگی ہیں درونِ خانۂ دل
مجھے یہ شک ہے کوئی گیت گانے والا ہوں

پرندے، تتلیاں، جگنو، پہنچ گئے ہیں نوید
انہیں میں اپنی کہانی سنانے والا ہوں

یہ جو صحرا کی طرف ایک سواری گئی ہے
شہرِ غم ناک کے ہر گھر سے گزاری گئی ہے

آنکھ میں آنے سے پہلے ہی ترے غم کی سپاہ
دل کے کوفے سے گزرتے ہوئے ماری گئی ہے

دل تڑپتا ہے کہ میں رنگ زدہ کر دوں اسے
ایک پتھر پہ جو تصویر اُبھاری گئی ہے

اس لیے کانپ رہا ہوں کہ سر شب تری یاد
ایک آیت کی طرح مجھ پہ اُتاری گئی ہے

سر بسجدہ رہے ہم بارگہِ غم کے حضور
بس، دعا کرتے ہوئے رات گزاری گئی ہے

سفید رنگ کے دروازے پر لکھا ہوا ہے
یہ شہر سرمئی یاقوت سے بنا ہوا ہے

سنہری جھیل میں روشن بدن نہا رہے ہیں
اور اُن کے سامنے سورج کا سر جھکا ہوا ہے

زمیں سے تا بہ فلک روشنی ہی روشنی تھی
مجھے لگا کہ درِ آسماں کھلا ہوا ہے

کہیں یہ آخری منظر بھی معجزہ تو نہیں
ہوائیں تیز ہیں لیکن دیا جلا ہوا ہے

عجیب شہر طلسمات ہے کہ جس میں نوید
کہیں چراغ، کہیں آئینہ پڑا ہوا ہے

کبھی جو دشت سے آتے ہیں زندگی اور میں
بدن میں خاک اُڑاتے ہیں زندگی اور میں

جب اِک ستارہ سر لوحِ دل اُترتا ہے
پھر اپنی راکھ اُٹھاتے ہیں زندگی اور میں

کبھی تو سامنے اپنے اِک آئینہ رکھ کر
کسی کو خوب رُلاتے ہیں زندگی اور میں

ملے جو لمحہ فرصت تو گیلی مٹی سے
سنہری کوزے بناتے ہیں زندگی اور میں

کوئی بلاتا ہے جب نفس مطمئن کہہ کر
وہیں پہ سجدے میں جاتے ہیں زندگی اور میں

پروں سمیت جہاں فاختائیں کٹتی ہیں
وہاں پہ پھول اُگاتے ہیں زندگی اور میں

تری کہانی ہر اِک کو سنانے والی نہیں
کسی کسی کو سناتے ہیں زندگی اور میں

فغاں کے بعد سر عام ناچنے کے لیے
زمیں پہ آگ بچھاتے ہیں زندگی اور میں

سیّد اذلان شاہ / گوجرہ

ہوتا ہے کچھ ایسے بھی اُداسی کا مداوا
آنسو نکل آتے ہیں کئی بار خوشی سے

سیّد اذلان شاہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، نقاد، ڈرامہ رائٹر، مدیر اور ناول نگار ہیں۔ اُن کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا ادبی پرچہ ''نزول'' اس وقت اپنے معیار اور مقدار کے لحاظ سے اہم ہے۔ ''نزول'' کا ہر شمارہ خاص ہوتا ہے اور اس میں قاری کے لیے بھرپور مواد ہوتا ہے۔ سیّد اذلان شاہ ادب اور شاعری سے متعلق گہرا تنقیدی شعور رکھتے ہیں۔ مختلف شعرا کے حوالے سے لکھے گئے اُن کے تنقیدی مضامین نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی اپنی شاعری نہایت شفاف اور اُجلی ہے۔ اُن کی غزل آج کے دور کی جدید غزل ہے جو کہ مکمل طور پر اپنے ہونے کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔ سیّد اذلان شاہ کی شاعری اپنے موضوعات، بنت، کرافٹ، تشبیہات اور استعاروں کے سبب نہایت منفرد ہے۔ (ارژنگ)

اُس نے بخشا ہے بڑا رُتبہ مقدر سے ہمیں
عشق دیمک کی طرح کھا گیا اندر سے ہمیں
یہ فقیری ہے اِسے ضعفِ بصارت نہ سمجھ
دیکھنا پڑتا ہے سب چشمِ تصور سے ہمیں
تیرے لوگوں کی گدائی کا پتہ چلتا ہے
سگِ مامور پہ پھینکے ہوئے پتھر سے ہمیں
تو کھڑا دیکھے گا دُنیا کی طرح سے ہم کو
وہ گزارے گا کبھی تیرے برابر سے ہمیں
اے چراغِ شبِ روشن دِرِ خستہ کے مکیں
تو ملا اور ملا کس کے مقدر سے ہمیں

چھوڑا مصلاً اینٹوں کا سرہانہ بھی گیا
شاہی ملی نہ اور فقیرانہ بھی گیا
توبہ ہوئی ہے تھوک کے خالی گلاس میں
دیوانگی میں مسلکِ رندانہ بھی گیا
جنگل میں ناچتے تھے پرندوں کے ساتھ پیڑ
محفل میں رقص کرنے کو دیوانہ بھی گیا
آ کر شدید غصے میں تسبیح توڑ دی
خود کو کبھی کبھار کا دہرانہ بھی گیا
لگنے لگا ہجوم مریدوں کا دشت میں
یعنی فقیر راہ کا ویرانہ بھی گیا

بات کرتے ہیں بہت دور تلک کرتے ہیں
لوگ درویش کی تنہائی پہ شک کرتے ہیں
بھیک دیتے نہیں مجبور سمجھ کر سب کو
یہ سخی لوگ بڑی چھان پھٹک کرتے ہیں
یہی خوبی تو ہے مجنوں کے طرف داروں میں
عشق کرتے ہیں تو سانس آخری تک کرتے ہیں
رونا پڑتا ہے کسی دوجے کی دیکھا دیکھی
ہاں میاں اشک بھی شعلوں سی لپک کرتے ہیں
پوچھنی ہوتی ہیں جب غیب کی باتیں تو یہ لوگ
پیش دُنیا کا ہمیں نان و نمک کرتے ہیں

کرتا ہوں خوشی سائے کی ہر بار خوشی سے
میں چومنے لگ جاتا ہوں دیوار خوشی سے
دل کہتا تھا تنہائی کے ذمے نہیں لگنا
میں چھوڑ کے آیا نہیں گھر بار خوشی سے
دنیا دیے جاتی تھی گلابوں کی مثالیں
روشن ہوئے جاتے تھے وہ رُخسار خوشی سے
ہوتا ہے کچھ ایسے بھی اُداسی کا مداوا
آنسو نکل آتے ہیں کئی بار خوشی سے
ہاتھ آئی ہے اب مالِ غنیمت میں محبت
دیکھو کہیں مر جائے نہ سردار خوشی سے

تیری دُنیا کے علاوہ نہیں دُنیا میری
تو بھی اے دوست ضرورت نہیں سمجھا میری
شاخ دے پاتی ہے پھولوں کو سہارا کب تک
تو یونہی فکر کیا کر نہ زیادہ میری
میں کہ بس طیش میں آؤں بھی تو رو پڑتا ہوں
مجھ کو ہر بار بچا جاتی ہے توبہ میری
میں جو پیچھے ہوں پڑا تیرے تو مسلک ہے مرا
دشمنی تو نہیں تجھ سے کوئی عشقا میری
روز ہوتا ہے مری پیاس کا رُتبہ اُونچا
روز آتا ہے قدم بوسی کو دریا میری

ایک ٹک دور کہیں دیکھتی آنکھوں جتنا
دن کے روشن ہوا جاتا تھا چراغوں جتنا
کوئی آتا ہی نہ تھا پاس دلاسہ دینے
مجھ کو رونا ہی پڑا دوسرے لوگوں جتنا
روز سنتے تھے چراغوں کی کہانی مجھ سے
پیار کرتے تھے پرندے مجھے اپنوں جتنا
نظر آنے لگے مجھ کو ڈھلے چہروں والے
میں نے مانگا تھا ثواب اپنے گناہوں جتنا
اِک دعا جیسی تمنا ہے مرے دل میں بھی
میں تجھے چاہوں کبھی چاہنے والوں جتنا

حمیرا راحت/ کراچی

ابر ہو رات ہو اور تنہائی ہو　　مجھ کو اس کے سوا اور کیا چاہیے

حمیرا راحت کی شاعری زندگی سے جڑی ہوئی ہے۔ اُن کے موضوعات اچھوتے اور منفرد ہوتے ہیں۔ وہ جدید غزل کی نہایت باکمال شاعرہ ہیں۔ سہل ممتنع میں کہی گئی اُن کی غزلوں میں مقبولیت کے بڑے امکانات ہیں۔ اُن کی شاعری کی خوشبو ملکی سرحدوں کو عبور کر کے بہت دور دور تک پھیل گئی ہے۔ حمیرا راحت کی شاعری عوامی اور ادبی حلقوں میں یکساں مقبول ہے۔ مشاعروں میں اُن کے کلام کو بہت سراہا جاتا ہے۔ وہ غزل کو غزل بنانے کے ہنر سے بخوبی آشنا ہیں۔ (ارژنگ)

قطرہ قطرہ پگھل رہی ہے رات
یہ دیا ہے کہ جل رہی ہے رات
تیری مٹھی میں بند ہے سورج
میرے ہمراہ چل رہی ہے رات
دن کے اک بیکراں سمندر میں
گرتے گرتے سنبھل رہی ہے رات
کھو دیا کیا کسی کو اِس نے بھی
آج کیوں ہاتھ مل رہی رات
ہے بظاہر یہ میری دوست مگر
چال دشمن سی چل رہی ہے رات
نام لیتے ہی تیرا ایسا لگا
سرخ پھولوں میں ڈھل رہی رات

مقدر سے بھی لڑنا چاہتی ہے
محبت ضد پہ اڑنا چاہتی ہے
عجب تیور دیے کی لو کے ہیں جو
ہواؤں سے جھگڑنا چاہتی ہے
کہیں تکمیل کی صورت نہ پا کر
کوئی خواہش بچھڑنا چاہتی ہے
بسایا تھا بڑی مشکل سے جس کو
وہ بستی پھر اُجڑنا چاہتی ہے
جو لکھا ہے مقدر کے ورق پر
تمنا اُس کو پڑھنا چاہتی ہے
کسی سے مل کر آنے والی لڑکی
بہانہ کوئی گھڑنا چاہتی ہے
غزل میں آج دیوی شاعری کی
نگینے چند جڑنا چاہتی ہے

وہ جانتا ہے کہ کیا کیا بدلنے والا ہے
جو اس زمین کا نقشہ بدلنے والا ہے
بس اک نگاہ سے اندازہ ہوگیا ہے کہ تو
ذرا سی دیر میں کتنا بدلنے والا ہے
ہوائے دربدری ہم سے اب سوال نہ کر
بس اتنا کہہ دے ٹھکانہ بدلنے والا ہے
تجھے گماں ہے کہ آنکھیں بدلنے والی ہیں
مجھے یقیں ہے تماشہ بدلنے والا ہے
دکھا رہا ہے نئے خواب میری آنکھوں کو
وہ ایک شخص جو رستا بدلنے والا ہے
یہ کہہ رہی ہے نئی صبح کی کرن مجھ سے
ترے نصیب کا لکھا بدلنے والا ہے

ہر ایک خواب کی تعبیر تھوڑی ہوتی ہے
محبتوں کی یہ تقدیر تھوڑی ہوتی ہے
پلک پہ ٹھہرے ہوئے اشک سے کہا میں نے
ہر ایک درد کی تشہیر تھوڑی ہوتی ہے
کبھی کبھی تو جدا بے سبب بھی ہوتے ہیں
سدا زمانے کی تقصیر تھوڑی ہوتی ہے
دعا کو ہاتھ اُٹھاؤ تو دھیان میں رکھنا
ہر ایک لفظ میں تاثیر تھوڑی ہوتی ہے
سفر یہ کرتے ہیں ایک دل سے دوسرے دل تک
دکھوں کے پاؤں میں زنجیر تھوڑی ہوتی ہے

نہ جی سکے ہیں مکمل نہ پورے مر سکے ہیں
تمہارے بعد کہاں کوئی کام کر سکے ہیں
ذرا سی دیر کو بس آئنہ ملا تھا ہمیں
ذرا سی دیر میں اتنا ہی ہم سنور سکے ہیں
اور آگے ایک سمندر بھی پار کرنا ہے
ابھی تو صرف یہی دشت پار کر سکے ہیں
نہ شاخ پر ہی کھلے پھول بن کے مہکے ہم
نہ سوکھے پتوں کی مانند ہم بکھر سکے ہیں
نہ جانے کتنی ملاقاتیں ہو چکی ہیں مگر
جو بات کرنی تھی تم سے کہاں وہ کر سکے ہیں
جو چاہتے ہیں کوئی بات بے جواز نہ ہو
وہ لوگ عشق کے دریا میں کب اُتر سکے ہیں

بددعا چاہیے یا دعا چاہیے
زندگی یہ بتا تجھ کو کیا چاہیے
ٹوٹنا آئنے کا مقدر ہے کیوں
عکس کو بھی کبھی ٹوٹنا چاہیے
ماں کی مسکان گڑیا کھلونوں کا گھر
مجھ کو پھر سے مرا بچپنا چاہیے
ابر ہو رات ہو اور تنہائی ہو
مجھ کو اس کے سوا اور کیا چاہیے

گلفام نقوی/ فیصل آباد

گھر بناتی ہوں تصور میں بہت پیارا سا　　اور پھر اس کے در و بام میں کھو جاتی ہوں

خوابوں کے پروان چڑھنے، ٹوٹنے اور بکھرنے کا عمل حسیاتی شعری روایت کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ حسیاتی شعری روایت میں طرزِ احساس ہی واحد ایسی کسوٹی ہے کہ جسے تخلیقی سطح پر تخلیق کار کی جمالیاتی خاصیت کا ادراک کرنے کے لیے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ طرزِ احساس کی سطح پر دیکھا جائے تو گلفام نقوی نے ایک مختلف کرۂ تخلیق دریافت کیا ہے۔ اکثر شاعرات کے شعری منہج کے برخلاف اُن کے ہاں حسیاتی شکست و ریخت خود آگہی کی تہذیب قدرت کی حامل دکھائی دیتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہ ہو کہ گلفام نقوی میں اپنے وجود کو بہا دینے کی بجائے اپنے تشخص کو بقایابی سے ہمکنار کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ اگر عصری نسائی شعری منظر نامے کو نظر میں رکھا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ گلفام نقوی بہت حد تک اپنے شعری رویوں کے انفراد کی بنا پر اپنے قاری کو متوجہ کرنے میں کامیاب ٹھہری ہیں۔ معاملاتِ ہجر و وصال ہوں یا تذکرۂ رنج و ملال ہو، بات سرخوشی کی ہو یا فریب، ریاکاری، تضاداتِ فکر و عمل کی بیان عہدِ گزشتہ کے دیے ہوئے زخموں کا ہو یا عہدِ تازہ تر کے لگائے ہوئے چرکوں کا ان کا اندازِ فکر و نظر انھیں مرتبہ خاص پر متمکن کرتا نظر آتا ہے۔ (جعفر حسن مبارک)

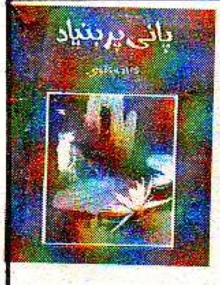

گلاب دل نہ ہوا آنسوؤں کے پانی سے
نہ کوئی داغ دُھلا آنسوؤں کے پانی سے
بہت قریب سے منزل کو دیکھ آئے ہیں
کہ راستہ نہ ملا آنسوؤں کے پانی سے
نشیمن ایسے جلا راکھ ہو گئے ہم بھی
دُھواں سا اُٹھنے لگا آنسوؤں کے پانی سے
جو اس کی سمت نہ جانے کا بند باندھا تھا
وہیں شگاف ہوا آنسوؤں کے پانی سے
بہت ہی ان دنوں زرخیز ہے یہ دل کی زمیں
ہوا ہے زخم ہرا آنسوؤں کے پانی سے
سلگتا رہ گیا تاب و تواں کے خانے میں
نہ عشق آگ بنا آنسوؤں کے پانی سے
نہ یاد آئے کبھی کاش کوئی بچھڑا ہوا
کہ بھیگتی ہے رِدا آنسوؤں کے پانی سے
یہ چاہتیں تو بھنور ہیں جو گھیرتی ہیں سدا
سو گل تو خود کو بچا آنسوؤں کے پانی سے

نہ خواب آنکھ میں ٹھہرے نہ اپنے گھر ٹھہرے
گھٹا کے ساتھ چلے اور بے ثمر ٹھہرے
پرندے لوٹ ہی جاتے ہیں شام ہوتے ہی
پلٹ کے آ نہ سکے پھر جو ہم سفر ٹھہرے
وہ جن کے ساتھ چلے تھے وہی نہ ساتھ رہے
بھٹک گئے تھے جو راہوں میں پھر نہ گھر ٹھہرے
وصالِ گل کی تمنا میں ہو گئے تنہا
مٹے یہ آس ادھوری تو چشم تر ٹھہرے
خلش سی بن کے اُترتے ہیں روح میں اکثر
محبتوں کے تقاضے جو بے اثر ٹھہرے
یہ رنگ اُڑ کے بکھرتے ہیں ننھے ہاتھوں پر
چمن کو چھوڑ کے تتلی جو دربدر ٹھہرے
ٹھہر تو جاؤں کسی محل میں ضیاء کی طرح
مگر تمنا مری یوں کسی نہ گھر ٹھہرے
ہوا کے ساتھ نہ اُڑنے کی بات کر گلفام
کہ جب وجود پہ اپنے نہ بال و پر ٹھہرے

دل نشیں صبح، حسیں شام میں کھو جاتی ہوں
ایک خاموش سے پیغام میں کھو جاتی ہوں
گھر بناتی ہوں تصور میں بہت پیارا سا
اور پھر اس کے در و بام میں کھو جاتی ہوں
یہ سفر وہ ہے جو طے ہوتا نہیں ہے مجھ سے
روز اِک خواہش بے نام میں کھو جاتی ہوں
جانے کیا گم ہے کئی برسوں سے کچھ یاد نہیں
چلتے چلتے جو رہِ عام میں کھو جاتی ہوں
کتنے منظر یونہی چپ چاپ گزر جاتے ہیں
قریہ حسرتِ ناکام میں کھو جاتی ہوں
بند آنکھوں میں کئی خواب اُترنے لگ جائیں
جب کسی لحۂ گلفام میں کھو جاتی ہوں

اب ذرا خود کو آزماتے ہیں
آج ہم تجھ کو بھول جاتے ہیں
رتجگوں کا ملال کرتے نہیں
آج کی رات سو ہی جاتے ہیں
تیری سانسوں کی نرم حدت سے
کیسے خود کو بھلا بچاتے ہیں
تیری خوشبو جو اوڑھ رکھی تھی
جسم و جاں سے اُسے ہٹاتے ہیں
بھول جاتے ہیں سارے وعدوں کو
خط تمہارے سبھی جلاتے ہیں
اب کہ ممکن نہیں بھلانا اُسے
کل سے پھر رابطہ بڑھاتے ہیں
شرط ہے ایک رات کی گلفام
ورنہ یہ سلسلہ بڑھاتے ہیں

شمیم الماس شمی /امریکہ

پیار ہے کس قدر اُس کو مجھ سے شمی چوڑیاں توڑ کر میں نے دیکھا نہیں

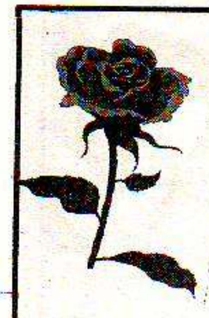

شمیم الماس شمی اُردو اور پنجابی کی معروف شاعرہ ہیں۔اُن کی شاعری نسوانی جذبوں کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔پاکستان میں مصروف ترین ادبی زندگی گزارنے کے بعد اب وہ امریکہ نیویارک میں مقیم ہیں۔وہاں وہ پنج ریڈیو USA سے وابستہ ہیں۔شمیم الماس شمی کا پہلا شعری مجموعہ ''محبت عذاب'' کے نام سے شائع ہوا جو کہ پنجابی نظموں اور غزلوں پر مشتمل تھا۔اس سے پہلے اُن کی اُردو نثر کی کتاب ''ابھی ہم تمہارے'' شائع ہوئی جسے خود کلامی بھی کہا جا سکتا ہے۔وہ خالص نسوانی جذبات کی ترجمان ہے۔شمیم الماس ادبی دُنیا میں کافی متحرک ہیں۔

اِک نظر اس طرف بھی اُٹھا دیجیے
میرے دل کو مدینہ بنا دیجیے
پاس بخشش کا کوئی وسیلہ تو ہو
نعت کہنا مجھے بھی سکھا دیجیے
میرے چاروں طرف ہیں دُکھوں کے پہاڑ
اپنی رحمت سے ان کو ہٹا دیجیے
چاند تاروں سے تو بات بنتی نہیں
سب جہانوں کو اپنی ضیاء دیجیے
آپؐ کے در سے اُٹھ کر جائے شمی
مجھ پہ اذنِ حضوری لگا دیجیے

تجھ کو آنا پڑا یہیں تو پھر
نہ ملا ہم سا گر حسیں تو پھر
کون تیرا خیال رکھے گا
بعد میرے ہوا حزیں تو پھر
جس پہ تجھ کو غرور ہے وہ دل
کھو گیا گر یہیں تو پھر
آ نہیں سکتا کوئی تجھ کو یاد
ٹوٹ جائے ترا یقیں تو پھر
دل کشادہ دلی پہ نازاں ہے
نہ ہوا وہ اگر مکیں تو پھر
سوچتی ہوں کہ کس لیے میں بھی
جب یہ طے ہے کہ تو نہیں تو پھر

دروازے پر جو آنکھیں ہیں
ان آنکھوں میں جو سپنے ہیں
اُن سپنوں میں جو مورت ہے
وہ میری ہے
دروازے کے باہر کیا ہے
اِک رستہ ہے
جس پر میری یادوں کا اِک شہر بسا ہے
میرا رستہ دیکھنے والی اُن آنکھوں کا جال بچھا ہے
مجھے پتہ ہے لیکن اُن آنکھوں کو کیسے میں یہ بات بتاؤں
ہر رستے پہ اتنی بھیڑ ہے
چلنا مشکل ہو جاتا ہے
آوازوں کے اس جنگل سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے
دکھ کا ایسا لمحہ آتا ہے ہنسنا مشکل ہو جاتا ہے
جب ایسے حالات کڑے ہوں
قدموں میں زنجیر کی صورت
روشنیوں کے سائے پڑے ہوں
ایسے میں دل اُن آنکھوں سے
ایک ہی بات کہے جاتا ہے
دیر سویر تو ہو جاتی ہے

جانے کس موڑ پر میں نے دیکھا نہیں
مڑ گیا ہم سفر میں نے دیکھا نہیں
تم کو معلوم ہو تو بتانا مجھے
رہ گئی میں کدھر میں نے دیکھا نہیں
وقت کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا اُسے
وہ گیا پھر کدھر میں نے دیکھا نہیں
لے کے آیا تھا میرے لیے روشنی
جب گیا چھوڑ کر میں نے دیکھا نہیں
تم گئے ساتھ اُس کے جدھر بھی کہیں
تم سمجھنا اُدھر میں نے دیکھا نہیں
پیار ہے کس قدر اُس کو مجھ سے شمی
چوڑیاں توڑ کر میں نے دیکھا نہیں

نذیر اے قمر / اسپین

میں اُس کے تصور سے نکل سکتا تھا باہر　　وہ مجھ کو مگر اتنی جدائی نہیں دیتا

نذیر اے قمر خوبصورت شاعر اور انتہائی مخلص انسان ہیں۔ اُن کے دو شعری مجموعے "بہار آنے تک" اور "چاند اکیلا ہے" شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی شاعری اُن کے حالات کی ترجمان ہے۔ وہ طویل عرصہ سے میڈریڈ (اسپین) میں مقیم ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں اُداسی اور ہجرت کے مضامین نہایت خوبصورت اور دل پذیر انداز میں پروئے گئے ہیں۔ اُن کی شاعری بھی اُن کی طرح سادہ اور آسان ہے۔ وہ "دریچہ" کے چیف ایڈیٹر بھی ہیں جو پاکستان اور اسپین سے بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ (ارژنگ)

میں اس لیے دن رات دہائی نہیں دیتا
کیا اُس کو مرا زخم دکھائی نہیں دیتا
زخمی ہے اسیری میں مری روح کا پنچھی
صیاد مگر اُس کو رہائی نہیں دیتا
دستار جو اپنوں کی سر بزم اُچھالے
میں اُس کے گناہوں کی صفائی نہیں دیتا
ہرگز نہ شمار اُس کو رقیبوں میں کرو تم
دشمن جو تمہیں کوئی برائی نہیں دیتا
میں اُس کے تصور سے نکل سکتا تھا باہر
وہ مجھ کو مگر اتنی جدائی نہیں دیتا
گہرا ہے قمر اُس کی نگاہوں کا سمندر
ایسا بھی ہے اُس میں جو دکھائی نہیں دیتا

عکس تیرا رُوبرو ہے آج بھی
مجھ کو تیری جستجو ہے آج بھی
وقت نے چہرے پہ جالے بن دیے
دل اگرچہ خوبرو ہے آج بھی
میرے ہاتھوں کی لکیروں میں لکھی
آپ ہی کی آرزو ہے آج بھی
زندگی کی طرز پہلی سی نہیں
موت لیکن ہوبہو ہے آج بھی
تو نہیں ہے سامنے میرے مگر
تیری خوشبو چار سو ہے آج بھی
ساری دُنیا دوستی کی راہ پر
وہ قمر اپنا عدو ہے آج بھی

تیرے بغیر بزم سہانی اُداس ہے
گلشن میں آج رات کی رانی اُداس ہے
اُترے ہیں کس جہان سے صدموں کے سلسلے
تیری تو اس زمیں کی کہانی اُداس ہے
دیکھو اُفق پہ پھیلی ہوئی ہیں جو سرخیاں
لگتا ہے آسمان کا بانی اُداس ہے
لب پہ مرے سدا کا تبسم ہے آج بھی
لیکن مری نگاہ کا پانی اُداس ہے
مدفون جس میں اب بھی ہیں ماضی کی کرچیاں
بچپن کی وہ حویلی پرانی اُداس ہے
اُس نے تو جو بھی چاہا قمر پا لیا مگر
اب تک مری وفا کی کہانی اُداس ہے

سینے میں مرے قید جو حسرت کا دھواں ہے
الفاظ کی صورت مری غزلوں سے عیاں ہے
زندہ ہوں تو لگتا ہے زمیں میرے لیے ہے
مرتا ہوں تو لگتا ہے کہ یہ میری کہاں ہے
میں درد کے موسم سے گزر آیا ہوں لیکن
موجود ابھی ذہن کے آنگن میں خزاں ہے
ہر نقش گزشتہ سے عیاں میری کہانی
ہر نقش جو آئندہ ہے وہ میرا نشاں ہے
کیا کیا نہ کیا اُس کے لیے میں نے گوارہ
اب جس کو مری دید کا منظر بھی گراں ہے
اِک آتشِ سوزاں ہے مرے فکر میں پنہاں
اُٹھتا مرے سینے سے جو دن رات دُھواں ہے
صدیوں کی ثقافت میں قمر آج بھی زندہ
گزرے ہوئے انسانوں کا اندازِ بیاں ہے

اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے
یاد کا سونا گھر لگتا ہے
تنہا سوچ کے زندانوں میں
اب جینا دوبھر لگتا ہے
کیوں الزام کسی کو دوں میں
اپنی ذات میں شر لگتا ہے
اس کو پیار سے بڑھ کر شاہد
اچھا مال و زر لگتا ہے
صاف اگر ہو دل کا شیشہ
پتھر بھی گوہر لگتا ہے
جیون تم کہتے ہو جس کو
مجھ کو ایک سفر لگتا ہے
آج قمر وہ پھول سا چہرہ
کیوں اتنا ابتر لگتا ہے

ارشد محمود ارشد / سرگودھا

بہت سنبھال کے رکھی ہوئی ہے آج تلک
تمہاری یاد کی تتلی مری کتاب کے بیچ

ہمارے ناقدین کا المیہ یہ ہے کہ وہ کسی نوآموز شاعر کے کلام کو پرکھنے کے لیے غالب اور میر کے معیار کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ غالب اور میر کی عظمت سے کوئی ذی ہوش انکار نہیں کرسکتا لیکن آج کا معاشرہ ان کے زمانوں سے یکسر مختلف ہے۔ انہیں سامع اور قاری دستیاب تھے لیکن آج کے شاعر کا المیہ یہ ہے کہ اسے قاری اور سامع دونوں میسر نہیں۔ اس صورت حال میں کسی نوجوان کا شعروادب سے تمسک رکھنا کسی جہاد سے کم نہیں اور مقامِ مسرت ہے کہ جناب ارشد محمود ارشد اس علمی وادبی جہاد میں صف اوّل کے قلمی سپاہی بن کر ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ ''کبھی میں یاد آؤں تو......'' ارشد محمود ارشد کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جس میں انہوں نے محض ہجر ووصال اور گل وبلبل ہی کو موضوع نہیں بنایا ہے بلکہ اپنے عہد کے مشاہدات اور تجربات کو نہایت فنی چابک دستی سے بیان کر دیا ہے۔ شاعری میں اپنے عہد کو محفوظ کرنا ایک تخلیقی رویہ ہے اور ارشد محمود ارشد نے یہ ''دُشوار'' کام انتہائی آسانی سے سرنجام دے دیا ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں ایک جانب روایت کی پاسداری ملتی ہے وہاں دوسری طرف جدید عہد کے تمام امکانات بھی جلوہ گر ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ارشد محمود ارشد اپنی تخلیق کی تیسری آنکھ کو اور کشادہ کریں گے تاکہ کائنات کے پوشیدہ اسرار بھی ان پر ہویدا ہوجائیں۔ (ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن)

آگ پانی کے برابر نہیں ہونے دیتا
عشق صحرا کو سمندر نہیں ہونے دیتا
کچھ تو میرا یہ مقدر نہیں ہونے دیتا
اور کئی کام ستمگر نہیں ہونے دیتا
یونہی چپ چاپ کنارے پہ کھڑا رہتا ہوں
خوف اندر کا شناور نہیں ہونے دیتا
خواب ٹوٹیں تو لہو دل کا اُمڈ آتا ہے
وہ مری آنکھ کو پتھر نہیں ہونے دیتا
خود بھی اس دُھوپ میں جلنا ہے مقدر اُس کا
جو کہ پودوں کو تناور نہیں ہونے دیتا
ایک مدت سے اُسے دل میں بسا رکھا ہے
میں تری یاد کو بے گھر نہیں ہونے دیتا
آ کے پیروں سے لپٹ جاتا ہے سایہ ارشد
وہ مجھے میرے برابر نہیں ہونے دیتا

مجھے ایسا بھی جانے کیا ہوا تھا
کھلی آنکھیں تھیں، میں سویا ہوا تھا
محل کیسے بدلتے ہیں کھنڈر میں
جبین وقت پر لکھا ہوا تھا
فصیلِ ہجر پر آنکھیں سجا کر
کسی نے سانس تک روکا ہوا تھا

مجھے منزل صدائیں دے رہی تھی
مگر میں راہ میں اُلجھا ہوا تھا
سرِمژگاں چمکتے موتیوں میں
کسی کا خواب بھی ٹوٹا ہوا تھا
مجھے پھر تو نے تنہا کر دیا ہے
بڑی مشکل سے میں تیرا ہوا تھا
تجھے ارشد وہ سب کچھ مل گیا ہے
ترے حصے میں جو لکھا ہوا تھا

اندھیرا اس لیے چھایا ہوا ہے
مرا سورج ابھی سویا ہوا ہے
مری آنکھیں یہ مجھ سے پوچھتی ہیں
تجھے پہلے کہیں دیکھا ہوا ہے
کسی پتھر کو شاید چھو لیا تھا
بدن شیشے کا تھا، ٹوٹا ہوا ہے
چھپایا دل میں تھا جو راز تو نے
تری آنکھوں سے وہ افشا ہوا ہے
تھکن آنکھوں کی یہ بتلا رہی ہے
مسافر رات بھر جاگا ہوا ہے
کہاں پر ہونٹ میں نے رکھ دیے تھے
مرا سارا بدن نیلا ہوا ہے
تری منزل ہے ارشد سچ کی منزل
جبھی تو راہ میں تنہا ہوا ہے

اُس نے ایسا بولا جھوٹ
سچ لگتا تھا اُس کا جھوٹ
قصہ گو کے افسانے میں
آدھا سچ تھا آدھا جھوٹ
سچائی کے دیپ جلاؤ
ڈس نہ جائے اندھا جھوٹے
اُس دن کیسی حالت ہوگی
جس دن کام نہ آیا جھوٹ
سب کے اپنے اپنے سچ ہیں
سب کا اپنا اپنا جھوٹ
زیرِ لب ہیں لاکھوں قسمیں
اور آنکھوں میں ہنستا جھوٹ
ارشد پورا تول کے بولو
کر دیتا ہے رُسوا جھوٹ

ضیاء اللہ قریشی / میانوالی

تکبر میں تباہی کا سدا امکان ہوتا ہے   گرے اُونچی عمارت تو بڑا نقصان ہوتا ہے

میانوالی کی سرزمین شعروادب کے حوالے سے بہت زرخیز ہے۔ محمد ضیاء اللہ قریشی کا تعلق بھی میانوالی سے ہے۔ ضیاء اللہ قریشی کی غزل میں جذبوں کی سچائی ہے۔ وہ نہایت سادگی اور آسانی سے اپنے دل کی بات کو غزل کا شعر بنا دیتے ہیں۔ اُن کی غزل ابھی پہچان کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ پھر بھی اُس کے تیور اتنے تیکھے ہیں کہ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں وہ اپنا منفرد اسلوب بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اُن کی غزل میں ایک سے زائد شعر قاری کو چونکانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

محبت کی کمی ہونے لگی ہے
ادھوری زندگی ہونے لگی ہے
قدم رکھتے ہی پہلا میرے گھر میں
روانہ پھر خوشی ہونے لگی ہے
کھلونوں کی جگہ دل ٹوٹتے ہیں
کہ گڑیا اب بڑی ہونے لگی ہے
یہ کس کے ہاتھ نے مجھ کو چھوا ہے
بدن میں روشنی ہونے لگی ہے
میں جس کے راستے پر چل رہا ہوں
وہ منزل غیر کی ہونے لگی ہے

اپنی آنکھوں پر بھی اُس دن رحم سا آیا مجھے
کچھ نہیں تھا سامنے جب دیکھنا آیا مجھے
اِک مسلسل جیت نے ایسا مجھے توڑا کہ پھر
ہارنے کے بعد ہی کچھ حوصلہ آیا مجھے
اے خدا! میرے خدا اس کارزارِ عمر میں
اِک محبت کے علاوہ اور کیا آیا مجھے

خون کے رشتوں میں بھی جب کھوٹ دیکھا تو ضیاءؔ
دوسروں سے زخم سہنے کا مزا آیا مجھے

ہزاروں راز ہیں خاکی مکان کے اندر
چھپا ہے آدمی اپنے گمان کے اندر
نکل گیا ہوں میں اپنے ہی دھیان سے باہر
وہ جب سے آیا ہے میرے ہی دھیان کے اندر
خدا کرے کہ وہ دل کا بھی اتنا اچھا ہو
بڑی مٹھاس ہے اُس کی زبان کے اندر
نظر کا تیر مرے دل پہ وار کر کے ضیاءؔ
پلٹ گیا ہے پھر اپنی کمان کے اندر

وہ کیا دے کسی کو دُعا زندگی کی
جسے مل رہی ہو سزا زندگی کی
کہ سن کر جسے نم نہ ہوں میری آنکھیں
کوئی بات ایسی بتا زندگی کی
چلو پھر اُسی شہر کو لوٹ جائیں
جہاں سے ہوئی ابتدا زندگی کی

ضیاءؔ آج وہ شخص بھی مر گیا ہے
جو کرتا تھا باتیں سدا زندگی کی

تنہا صبحیں، تنہا شامیں چھوڑ گیا
جانے والا کیسی یادیں چھوڑ گیا
ہر کمرے سے اُس کی خوشبو آتی ہے
میرے گھر میں اپنی سانسیں چھوڑ گیا
خود تو ضیاءؔ وہ سویا چین کی نیند مگر
میری آنکھ میں کچھ نیندیں چھوڑ گیا

''تکبر'' میں تباہی کا سدا امکان ہوتا ہے
گرے اُونچی عمارت تو بڑا نقصان ہوتا ہے
ہزاروں لوگ بے گھر ہو گئے ہیں چند لمحوں میں
ہوا میں گھر بنانے کا یہی تاوان ہوتا ہے

سہیل انجم شہزاد

سونی پڑی ہے قبر کے تعویذ کی طرح
اس دل کی کائنات پہ رونا تو آئے گا

"فرقت کی چاندرات" سہیل انجم شہزاد کا خوبصورت شعری مجموعہ ہے۔ سہیل انجم شہزاد شاعری کا رس زندگی سے کشید کرتے ہیں۔ اُن کی غزل میں چند شعر ایسے ضرور ملتے ہیں کہ بے ساختہ دل داد دیتا ہے اور زبان "واہ واہ" کہتی ہے۔ سہیل انجم شہزاد کی غزل اُن کی فکر، سوچ اور جذبات کی بھرپور ترجمان اور عکاس ہے۔ وہ ہنر شعر سے بخوبی آشنا ہیں۔ اُن کی شاعری میں ارتقاء کا عمل اُن کے روشن مستقبل کی نوید ہے۔(ارژنگ)

دل کو پتھر آنکھیں پانی کر لیتے ہیں
اب کیا ملنا ختم کہانی کر لیتے ہیں
ہجر کی گرمی، وصل کی ٹھنڈک، دل مانے تو
ایک جگہ پر آگ اور پانی کر لیتے ہیں
بوتل میں جو زہر بھرا ہے، تم بھی پی لو
ہم بھی پی کر شام سہانی کر لیتے ہیں
ہم ہیں شاعر، میٹھے گیت سنانے والے
دُشمن دل کو دل کا جانی کر لیتے ہیں
سو جاتے ہیں اوڑھ کے یادوں کی چادر کو
انجم تازہ، یاد پرانی کر لیتے ہیں

پل میں عجب ہوا کہ وہ بے چین ہو گیا
پل میں خوشی چلی گئی اور بین ہو گیا
پل میں کسی نگاہ کا ایسا ہوا اثر
پل میں غرورِ بے کراں نعلین ہو گیا
پل میں یہ کائنات ہماری نہیں رہی
پل میں حجاب زُلف کا مابین ہو گیا
پل میں کسی کے عکس نے جادو سا کر دیا
پل میں کسی کا آئنہ بے نین ہو گیا
پل میں ہوا یہ معجزہ انجم دُعا کے بعد
پل میں نظر کا نور شریفین ہو گیا

فرقت کی چاند رات پہ رونا تو آئے گا
سولی چڑھی حیات پہ رونا تو آئے گا
دو بوند بھی نہ دے سکا پیاسے حسینؓ کو
پانی بھرے فرات پہ رونا تو آئے گا
اُڑتی ہوئی قطار پرندوں کی دیکھ کر
تنہا سی ایک ذات پہ رونا تو آئے گا
غم تھا تو غم گسار بھی آتا تھا پوچھنے
غم سے ملی نجات پہ رونا تو آئے گا
دو چار دن کے پیار کی کچھ اہمیت نہیں
دو چار دن کے ساتھ پہ رونا تو آئے گا
سونی پڑی ہے قبر کے تعویذ کی طرح
اس دل کی کائنات پہ رونا تو آئے گا
انجم جب اس کا وصل بھی چندن نہ کر سکا
احساس کی وفات پہ رونا تو آئے گا

آنکھوں میں تیرے ہجر کا جالا پڑا رہا
وہم و گمان سے مرا پالا پڑا رہا
ہم سے ملیں سنبھل کے تکبر پسند لوگ
ہم وہ ہیں جن کے پاؤں ہمالہ پڑا رہا
تاریکیوں کی چاہ میں حد سے گزر گئے
یوں تو قدم قدم پہ اُجالا پڑا رہا
حالانکہ اُس کی آنکھ میں نفرت کی آگ تھی
پھر بھی لہو کا سرد جوالہ پڑا رہا
جس میں تھی بورچی ہوئی خونِ غریب کی
تھا دسترس میں پر وہ نوالہ پڑا رہا
گزرا مرے قریب سے نظریں چرا کے یوں
خالی مری نگاہ کا پیالہ پڑا رہا
جادو نہ چل سکا کوئی تدبیر کا سہیل
تقدیر کے کواڑ پہ تالا پڑا رہا
انجم محاذِ جنگ پہ جاتے بھی کس طرح
اپنا تو اپنے آپ سے پالا پڑا رہا

ساحل سلہری / سیالکوٹ

جانے کیا بات ہے بچھڑ کر بھی
اِک سکوں سا ترے خیال میں ہے

موجودہ دور میں نئے شعراء کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا مگر اچھے کلام کی وجہ سے شہرت اور کامیابی کسی کسی پر مہربان ہوئی۔ ساحل سلہری کا شمار جدید دور کے بہترین غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کا کلام نوجوان نسل میں خاصی پذیرائی رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک شاعری حصولِ مسرت کا ذریعہ ہے۔ وہ جذبات و احساسات کی بات کرتے ہیں۔ ساحل سلہری عصر حاضر کے خوبصورت رومانوی شاعر ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''محبت روگ بن جاتی ہے'' 2005ء میں منظر عام پر آیا۔ نیا شعری مجموعہ ''کوئی کمی سی ہے'' ابھی زیرِ طبع ہے۔ (ندیم اسلم)

کوئی ایسا سبب نہیں ہوتا
ذکر بھی تیرا اب نہیں ہوتا
زندگی بھی بٹی سی رہتی ہے
تو مرے پاس جب نہیں ہوتا
جو اُسے آرزو نہیں میری
میں بھی دست طلب نہیں ہوتا
جس غزل میں نہ ذکرِ جاناں ہو
وہ ادب کچھ ادب نہیں ہوتا
ہر گھڑی دل پکارتا ہے تجھے
تو تصور میں کب نہیں ہوتا

سامنے آ کے تصور کو مسلسل کر دو
شعر کا مصرعہ ادھورا ہے مکمل کر دو
میں نہیں سہہ سکوں گا تیری جدائی کے غم
ایک احسان کرو، تم مجھے پاگل کر دو
ایک مدت سے مری جان میں تشنہ لب ہوں
یوں کرو میرے خدوخال کو جل تھل کر دو
پیار سے، مان سے چاؤ سے، کبھی چاہت سے
ہاتھ، ہاتھوں پہ دھرو اور مجھے صندل کر دو

اِک خلش ایک تشنگی سی ہے
زندگی میں کوئی کمی سی ہے
میری حالت ترے بچھڑنے سے
ایک معذور آدمی سی ہے

لگ رہا ہے کہ بام پر ہیں وہ
اس لیے رات چاندنی سی ہے
چل کسی مے کدے مجھے لے چل
اے شب ہجر بے کلی سی ہے
روز میں دیکھتا ہوں جی بھر کے
تیری تصویر دیدنی سی ہے
اس کے ہونٹوں سے پھول جھڑتے ہیں
گفتگو اُس کی شاعری سی ہے
وہ سر رہ مجھے ملا ساحلؔ
آج من میں عجب خوشی سی ہے

بات کچھ تو ترے جمال میں ہے
اس لیے سانس اشتعال میں ہے
ایک دن لمس پا ہوا تھا وہ
یہ بدن اب تلک وصال میں ہے
جانے کیا بات ہے بچھڑ کر بھی
اک سکوں سا ترے خیال میں ہے
میں تو سنبھلا ہوں بھول کر تجھ کو
جانِ جاں دل ابھی ملال میں ہے
آپ آئے تو رُت بدل سی گئی
آج موسم بھی اعتدال میں ہے

جسم و جاں بے زار ہے تیرے بغیر
زندگی آزار ہے تیرے بغیر
کٹ تو جائے گی مسافت یارِ من
ہاں مگر دُشوار ہے تیرے بغیر
اب کوئی لگتا نہیں اپنا مجھے
محفل اغیار ہے تیرے بغیر
ایسے کیسے دل سہے گا فرقتیں
مے کدہ درکار ہے تیرے بغیر
تیرے دم سے رونقیں ہیں شہر میں
یہ جہاں بے کار ہے تیرے بغیر

احساس کی خوشبو یہ لگن تیرے لیے ہے
چاہت سے بھرا دل کا چمن تیرے لیے ہے
ہر شعر میں تیرے ہی خدوخال ڈھلے ہیں
ہر لفظ محبت کا سجن تیرے لیے ہے
دے دوں میں خوشی سے تو اگر جان بھی مانگے
یہ روح، یہ پیکر، یہ بدن تیرے لیے ہے
چوکھٹ پہ مہکتے ہیں ترے پیار کے گلشن
آنگن میں محبت کی پون تیرے لیے ہے

ابرار ندیم / لاہور

انا کی بات ہے ورنہ محبت اب بھی باقی ہے
اُسے میری مجھے اُس کی ضرورت اب بھی باقی ہے

ابرار ندیم اُردو اور پنجابی کے نامور شاعر ہیں۔ وہ ریڈیو پاکستان میں سینئر پروڈیوسر اور ماہنامہ ارژنگ کے اعزازی مدیر ہیں۔ سادہ اور آسان زبان میں شاعری کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری قاری کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ نوجوان نسل میں اُن کی شاعری کافی مقبول ہے۔ چند شعر تو زبان زدِ عام ہیں۔ ابرار ندیم ''چلتے چلتے'' کے عنوان سے کالم بھی لکھتے ہیں۔ اُن کے کالم بھی ان کی شاعری کی طرح جاندار ہوتے ہیں۔ وہ فطرتاً شگفتہ مزاج ہیں اور یہی مزاج کی شگفتگی اُن کی نثر میں بھی ملتی ہے۔ ابرار ندیم کے فن وشخصیت کے حوالے سے نامور ناقدین فن نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کو بہت سراہا ہے۔ (ارژنگ)

اُس سے ملتے نام سی صورت نکالوں کس طرح
شعر میں الہام سی صورت نکالوں کس طرح
چاند سا چہرہ نہ اُس کے پھول سے نقش و نگار
ذہن سے وہ عام سی صورت نکالوں کس طرح
سوچتا رہتا ہوں دن بھر اُس سے ملنے کے سبب
ہجر میں آرام سی صورت نکالوں کس طرح
اب بھی اُس کی واپسی کا منتظر رہتا ہوں میں
حسرتِ ناکام سی صورت نکالوں کس طرح
توڑ کر اُس سے تعلق سب پرانے واسطے
زندگی میں کام سی صورت نکالوں کس طرح

شعور و عقل سے باہر یقیناً معجزہ ہوگا
اگر مجھ سے زیادہ کوئی تم کو چاہتا ہوگا
بہر صورت مجھے تو جاگنا ہے شب گزیدہ ہوں
تمہارا غم نہیں ہوگا تو کوئی دوسرا ہوگا
ملو تنہائی میں، تم کو اگر کوئی شکایت ہے
سر بازار اتنی بھیڑ میں کیسے گلہ ہوگا
مرا جاتا ہوں میں جس کی جدائی کے تصور سے
حقیقت میں جدا ہوگا تو کیسا سانحہ ہوگا
کرو کم فاصلے ابرارؔ گر ہے خوف شدت کا
بڑھیں گی شدتیں اتنی ہی جتنا فاصلہ ہوگا

مانا کہ اب وہ پہلے سی نسبت نہیں رہی
ایسا نہیں کہ تجھ سے محبت نہیں رہی
یوں تو کھلے ہیں اب بھی کئی راستے مگر
اب واپسی کی کوئی بھی صورت نہیں رہی
تیرے بغیر مڑ کے کبھی دیکھ تو سہی
آنکھوں میں غم ہی غم ہے شرارت نہیں رہی
جلتے ہیں یوں تو اب بھی تیری یاد کے چراغ
پہلے سی ان میں دوست حرارت نہیں رہی
اتنے فریب کھائے ہیں اُلفت کے نام پر
اُلفت کے نام کی کوئی حسرت نہیں رہی

کشمکش ہے زندگی میں وہ کہ حاصل کچھ نہیں
میں کسی قابل نہیں یا میرے قابل کچھ نہیں
ٹھہرے پانی کی طرح ساکت ہے اپنی زندگی
ایک مدت سے ہمارے دل میں ہلچل کچھ نہیں
ایک لمحہ ہی کوئی ہو درد سے خالی کہاں
اور بظاہر جسم و جاں میں ایسا گھائل کچھ نہیں
زندگی دلکش ہے اب بھی ہاں مگر تیرے بغیر
اِک ادھورا پن ہو جیسے اور مکمل کچھ نہیں
اپنے حصے کی اذیت کاٹنی ہے خود مجھے
ساتھ میرے کوئی سایہ کوئی آنچل کچھ نہیں

سینے میں کوئی غم سا جگا اے ہوائے شام
لے کر کسی کی یاد پھر آ اے ہوائے شام
دل پھٹ نہ جائے درد کی شدت سے پھر کہیں
رونے دے آج کھل کے ذرا اے ہوائے شام
شاید اُسے بھی یاد ہوں پچھلی رفاقتیں
رہنے دے ایک جلتا دیا اے ہوائے شام
سینے پہ کوئی بوجھ سا رہتا ہے ہر گھڑی
رہتا ہے ایک درد سدا اے ہوائے شام
کس حال میں وہ ان دنوں رہتا ہے اے ندیمؔ
احوال اُس کا کچھ تو بتا اے ہوائے شام

ایک مدت سے جسے دیکھا نہیں
آج بھی وہ ذہن سے اُترا نہیں
آج بھی وہ ٹوٹ کر آتا ہے یاد
آج بھی میں رات بھر سوتا نہیں
آج بھی سچا ہوں اپنے عشق میں
آج بھی وعدہ میرا جھوٹا نہیں
آج بھی دریا ہے میرے سامنے
آج بھی میرا یقیں کچا نہیں
آج بھی قائم ہوں اپنے ضبط پر
آج بھی میں ٹوٹ کر بکھرا نہیں

ادبی خبریں/تقریبات

نامور شاعر شہزاد احمد کی یاد میں......

لاہور آرٹس کونسل کے زیرِ اہتمام نامور شاعر، ادیب، محقق اور مجلس ترقی ادب کے سابقہ ڈائریکٹر شہزاد احمد مرحوم کی یاد میں تعزیتی ریفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت نامور ناول نگار، افسانہ نویس اور کالم نگار انتظار حسین نے کی۔ مہمانانِ خصوصی نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر اور معروف شاعر ظفر اقبال تھے۔ نظامت کے فرائض طارق عزیز نے سرانجام دیے۔ چیئرمین لاہور آرٹس کونسل عطاء الحق قاسمی نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''ادب کے بڑے بڑے نام رُخصت ہوتے جاتے ہیں اور اُن کی جگہ خالی نظر آتی ہے جیسے احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، جون ایلیا، منیر نیازی رُخصت ہوئے تو اُن کی جگہ لینے والا کوئی نام نظر نہیں آتا اس طرح شہزاد احمد کے بعد کیا کوئی اور شہزاد احمد ہے؟ انھوں نے شہزاد احمد کے حوالے سے زندگی کے چند دلچسپ واقعات بھی سنائے۔ اصغر ندیم سیّد نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ''ہمیں دُکھ اس بات کا ہے کہ ہم اتنے پڑھے لکھے دانشور اور ادیب کے علم سے کماحقہ استفادہ نہیں کر سکے۔ ہمیں اُن سے کچھ اور سیکھنا چاہیے تھا۔ بشریٰ اعجاز نے شہزاد احمد کی محبتوں کو یاد کیا۔ مسعود اشعر، خالد احمد، نجیب احمد، ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے اظہارِ خیال میں شہزاد کی شخصیت اور زندگی سے متعلق بات کی اور انہیں عہدِ حاضر کا نامور شاعر قرار دیا۔ اس ریفرنس میں شاعروں اور ادیبوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

معروف مزاحیہ شاعر حاجی نذیر نادان مرحوم کی یاد میں تعزیتی ریفرنس

بزمِ ریاض رحمانی خیر پور ٹامے والی کے زیرِ اہتمام معروف مزاحیہ شاعر نذیر نادان مرحوم کی یاد میں تعزیتی ریفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں شعراء نے نذیر نادان کی زندگی، شخصیت اور شاعری سے متعلق نظمیں اور مضامین پڑھے۔ ریفرنس کی صدارت مخدوم غلام رضا بخاری نے کی۔ مہمانِ خصوصی ماسٹر بشیر احمد سیال، جناب ڈاکٹر عابد حسین سیال جبکہ مہمانانِ اعزاز مخدوم الحسن بخاری اور حسن عباسی تھے۔ جن شعراء نے اپنے مضامین اور کلام پیش کیا اُن میں عباس شمسی، عمران شاہ عزمی، سردار عباسی، اکرم پیرزادہ، مشتاق تنویر، عزیز مضطر، آزاد خیر پوری، بشیر رحمانی، عابد سیال، حسن عباسی اور صاحبزادہ رشید عثمانی شامل ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ملنے پر مبارک باد

نامور کالم نویس، مزاح نگار، ڈرامہ رائٹر اور شاعر جناب عطاء الحق قاسمی کو مجلس فروغ اُردو ادب (دوحہ قطر) کی جانب سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دینے کا فیصلہ جیوری نے سنا دیا ہے جس کے چیئرمین ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی ہیں۔ یہ ایوارڈ نومبر میں مجلس فروغ اُردو ادب کی طرف سے منعقدہ ایک عالمی تقریب میں دیا جائے گا۔ ادارہ ارژنگ اُن کو یہ حاصل عمر ایوارڈ ملنے پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

یوم آزادی پر سیفما کا مشاعرہ

14 اگست کو سیفما لاہور کے دفتر میں ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس کی نظامت معروف شاعرہ اور PILAC کی ڈائریکٹر صغرا صدف نے کی۔ جن شعراء نے کلام پیش کیا اُن میں اعزاز احمد آذر، احمد عقیل رُوبی، غافر شہزاد، ڈاکٹر شاہدہ دلاور، حسن عباسی، عامر بن علی، شفیق احمد خاں، منور سلطانہ، تسنیم کوثر، صابر حسین صابر کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

لاہور آرٹس کونسل کا نعتیہ مشاعرہ

ماہِ رمضان کے مقدس مہینے میں لاہور آرٹس کے زیرِ اہتمام ایک نعتیہ مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت نامور شاعر ظفر اقبال نے کی۔ مہمان خصوصی معروف شاعر نجیب احمد تھے۔ نظامت کے فرائض سرور حسین نقشبندی نے ادا کیے۔ اس مشاعرے میں خالد احمد، اعجاز کنور راجہ، نجیب احمد، ناصر زیدی، راجہ رشید محمود، رفیع الدین ذکی قریشی، محمد شہزاد مجددی، عباس تابش، واجد امیر، عمران نقوی، حسن عباسی، یٰسین قمر، ناصر بشیر، خواجہ غلام قطب الدین فریدی، عزیر احمد، رخشندہ نوید، بشریٰ اعجاز، صوفیہ بیدار، ابرار ندیم، حسن عسکری کاظمی، سلطان محمود، اکرم سحر فارانی، صغریٰ صدف، سرور حسین نقشبندی، فاطمہ غزل، رابعہ رحمٰن، راحیلہ رباب اور ایوب ندیم نے شرکت کی۔

بیاض کا ماہانہ مشاعرہ

بیاض کا ماہانہ مشاعرہ 15 ستمبر شام 6 بجے الحمراء ادبی بیٹھک لاہور میں منعقد ہوگا۔ طرحی مصرع ہے:

''کوچۂ یار میں سائے کی طرح رہتا ہوں''

جمالِ ادب کا اجراء

ادارہ ''نزول'' کی جانب سے عالمی ادبی جریدے ''جمالِ ادب'' کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ شاعر ادیب اپنی نگارشات اس پتہ پر روانہ کریں۔ سیّد اذلان شاہ، 18 پی او بکس گوجرہ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔

اظہارِ تعزیت

میلسی کے معروف شاعر جناب خورشید بیگ میلسوی کی جواں سال بیٹی کی وفات پر تمام شاعر ادیب اور ارژنگ کے عہدیداران اُن کے غم میں برابر شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی بیٹی کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور اُنہیں صبر جمیل دے۔ آمین

اظہارِ تعزیت

پروفیسر ظہیر خان طویل علالت کے بعد کراچی میں انتقال کر گئے۔ وہ ایک مشاق نثر نگار، شاعر اور ماہر تعلیم تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

دُعائے صحت کی اپیل

معروف شاعرہ اور ادیبہ ڈاکٹر شہناز مزمل کے لیے تمام احباب سے دُعائے صحت کی اپیل ہے۔ وہ گزشتہ ہفتے ایک حادثہ کے بعد بازو فریکچر کی تکلیف میں ہیں۔ اللہ اُنہیں جلد صحت یابی دے (آمین)

اظہارِ تعزیت

معروف شاعر سعد اللہ شاہ کی والدہ خالقِ حقیقی سے جا ملی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں غریقِ رحمت کرے۔ اللہ تعالیٰ سعد اللہ شاہ، ثناء اللہ شاہ اور تمام پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

ادبی وثقافتی تنظیم ''دستک'' کے زیرِ اہتمام محفل مشاعرہ

ادبی وثقافتی تنظیم ''دستک'' کے زیرِ اہتمام لاہور سے تشریف لائے ہوئے بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر اور سفرنامہ نگار حسن عباسی کے اعزاز میں ایک پروقار محفل مشاعرہ منعقد کی گئی جس کی صدارت جنوبی پنجاب کے سینئر اور پختہ غزل کہنے والے اُستاد شاعر اظہر ادیب نے کی۔ مہمانِ خصوصی صاحب شام حسن عباسی تھے اور مہمانِ اعزاز محبوب حسین تھے۔ نظامت کے فرائض شاہد قزلباش نے انجام دیے۔ مشاعرہ میں جن شعراء نے اپنا کلام پیش کیا اُن میں افضل عباسی، صاحبزادہ لیاقت علی، منور ضیا قادری، ناصر محمود لالہ، شہباز حمید گوہر، مزمل سعدی، باسط اسماعیل، شاہد یاسر، خاور اسد، شہزاد عاطر، شہباز نیر، جبار واصف، جاوید حمید خلجی، ہدایت کاشف، خالد محمود ذکی، سعید ناصر، ڈاکٹر کبیر اطہر اور رضوانہ سعید روز شامل ہیں۔

ادبی وثقافتی تنظیم ''سخنور'' کے زیرِ اہتمام محفل مشاعرہ

22 اگست 2012ء کی شام رحیم یار خان کی نمائندہ اور متحرک ادبی وثقافتی تنظیم ''سخنور'' کے زیرِ اہتمام قطر/دوحہ سے تشریف لائے ہوئے شاعر فہیم الدین ہاشمی کے اعزاز میں ایک محفل مشاعرہ منعقد کی گئی جس کی صدارت جاوید حمید خلجی نے کی۔ مہمانِ خصوصی خاور اسد تھے اور مہمانِ اعزاز باسط اسماعیل تھے۔ جبکہ نظامت کے فرائض شہباز نیر اور قمر بشیر نے انجام دیے۔ شعراء میں مزمل سعدی، ناصر محمود لالہ، جبار واصف، راشدہ کامل، شہزاد عاطر اور دیگر شعرائے رحیم یار خان شامل تھے۔

مبارک باد

رحیم یار خان کی نمائندہ ادبی تنظیم ''سخنور'' کے جنرل سیکرٹری، ایف ایم ریڈیو کے (R.J) اور معروف نوجوان شاعر شہباز نیر کو پنجاب پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں بطور لیکچرار منتخب ہونے اور پوسٹنگ ملنے پر مبارک۔

فرتاش سیّد کے اعزاز میں محفل مشاعرہ

ادبی وثقافتی تنظیم ''سخنور'' کے زیرِ اہتمام 19 جولائی 2012ء کی شب قطر/ دوحہ سے تشریف لائے ہوئے بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر فرتاش سیّد کے اعزاز میں ایک شاندار محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت مرشد سعید ناصر نے کی۔ مہمانِ خصوصی صاحب شام جناب فرتاش سیّد تھے۔ جبکہ مہمانانِ اعزاز سید خلیل بخاری اور جبار واصف تھے۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض شہباز نیر نے انجام دیے۔

نعتیہ مشاعرہ

رحیم یار خان کی ادبی تنظیم ''انجمن فروغِ ادب'' کے زیرِ اہتمام ماہِ رمضان کے آخری عشرہ میں نعتیہ مشاعرہ اور محفل نعت منعقد کی گئی جس کی صدارت بزرگ نعت گو شاعر غلام مصطفیٰ قمر نے کی۔ مہمانِ خصوصی معروف نعت خواں محمد صابر یوسفی تھے۔ نظامت کے فرائض شہباز حمید گوہر نے انجام دیے۔ شعراء میں خاور اسد، مزمل سعدی، ناصر محمود لالہ، شہباز نیر، جبار واصف اور خالد محمود ذکی شامل تھے۔

حسن عباسی کے سفرناموں اور شاعری کے حوالے سے مقالے

معروف شاعر، سفرنامہ نگار اور ماہنامہ ''ارژنگ'' کے مدیر حسن عباسی کے سفرناموں کے حوالے سے لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی کی طالبہ قرۃ العین نے لیکچرر نورین رزاق کے زیرِ نگرانی مقالہ مکمل کر لیا ہے۔ اس میں حسن عباسی کے دو سفرنامے ''محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو'' اور ''ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا'' شامل ہیں۔ اس سے قبل حسن عباسی کی شاعری اور فن و شخصیت کے حوالے سے یونیورسٹی آف سرگودھا سے ایم اے کا مقالہ میمونہ نذیر گوندل نے ڈاکٹر طاہر تونسوی کے زیرِ نگرانی مکمل کیا ہے۔

فرتاش سیّد کے ساتھ شام

انجمن ترقی پسند مصنفین ملتان کے زیرِ اہتمام قطر سے آئے ہوئے شاعر فرتاش سیّد کے ساتھ شام منائی گئی۔ صدارت رضی الدین رضی، فن و شخصیت پر گفتگو سجاد نعیم اور ڈاکٹر قاضی عابد نے کی۔ شعراء میں راؤ حیدر اسد، عامر یاسر مگسی، ارشد عباس ذکی، امجد صابری، منور آکاش، خرم جاوید، ڈاکٹر ابرار عالی اور دیگر نے شرکت کی۔ نظامت خاور نوازش نے کی۔

انتقال پرملال

ملتان کے معروف نعت گو شاعر تابش سمدانی کی بیوی اور معروف شاعر رہبر سمدانی کی والدہ انتقال کر گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین)

تعزیتی ریفرنس

صادق آباد کی ادبی تنظیم ''دستک'' کے زیرِ اہتمام اُردو اور سرائیکی شعر کہنے والے اُردو شعری مجموعہ ''شاخِ انا'' کے خالق شاہد عباسی کی یاد میں ایک تعزیتی ریفرنس/ اجلاس منعقد کیا گیا جس میں شاہد عباسی کے فن و شخصیت پر گفتگو ہوئی اور آخر میں اُن کے ایصالِ ثواب اور مغفرت کے لیے دُعا کی گئی۔ اس اجلاس میں افضل عباسی، منور ضیا قادری، شاہد ندیم قزلباش، صغیر احمد صغیر، شہباز نیر، ڈاکٹر کبیر اطہر اور دیگر شامل تھے۔

نعتیہ مشاعرہ

حلقہ پاسبانِ ادب کا نعتیہ مشاعرہ معروف شاعرہ حسن بانو کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا جس کی صدارت معروف شاعر سعید قریشی نے کی اور مہمانِ خصوصی درِ نجف زیبی تھیں۔ دیگر شعرائے کرام میں حُسن بانو، کامران ناشط، شبیر رحمانی، عذرا اصغر، باقی احمد پوری اور کرامت بخاری شامل ہیں۔

پنجابی مشاعرہ

Pilac کے زیرِ اہتمام ایک پنجابی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں پورے پنجاب سے نامور شعراء کرام نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض Pilac کی ڈائریکٹر معروف شاعرہ ماہنامہ وجدان کی چیف ایڈیٹر ڈاکٹر صغرا صدف نے ادا کیے۔

''کھیل تماشا'' معروف مصنفہ نائلہ سجاد کے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی کے لیے لکھے گئے دلچسپ ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ یہ ڈرامے مصنفہ نے ہکس ہاؤس سکول سسٹم میں رہتے ہوئے پیش کیے اور خوب پذیرائی ملی۔ اس کتاب کی اشاعت سے سکولوں اور کالجوں کے طلبہ وطالبات کے لیے ڈراموں کی کتابوں میں ایک خوبصورت اضافہ ہوا ہے۔ قارئین کے مطالعہ کے لیے آسان زبان میں مواد فراہم کیا گیا ہے۔ اس خوبصورت کتاب کی اشاعت کا اہتمام لاہور کے معروف ادارے ادارۃ الادیس نے کیا ہے۔ کتاب کے حوالے سے عطاء الحق قاسمی، پروفیسر اعجاز ارشد اور حسن عباسی کی آراء قابل ذکر ہیں۔ کتاب کی قیمت -/300 روپے ہے۔

''کنارے نیل'' معروف سفرنامہ نگار کے-اشرف کا تازہ سفرنامہ ہے۔ کے-اشرف نے اپنے منفرد اسلوب اور دلچسپ نثر کے باعث قارئین کے دل موہ لیے ہیں۔ ان کے سفرنامے قارئین میں بہت دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں اور مقبول ہو رہے ہیں۔ اردو میں اچھے سفرناموں کی کمی نہیں۔ مختلف ادوار میں اردو زبان کو اچھے سفرنامہ نگار میسر آتے رہے ہیں۔ کے-اشرف کے سفرنامے بھی اردو سفرنامے کی درخشندہ روایت میں اضافے کا باعث ہوں گے۔ ''کنارے نیل'' میں انھوں نے اپنے سفرنامہ مصر کا احوال اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اس سفر میں مصنف کے ہمراہ ہے۔ سرورق انتہائی خوبصورت اور کتاب حسن اشاعت کا نمونہ ہے۔

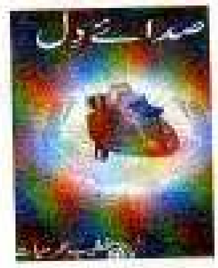

''صدائے دل'' معروف مصنف خطیب عمر حیات کی تازہ کتاب ہے۔ اس سے قبل ان کی دو کتب ''چاند کا پیغام بنی آدم کے نام'' اور ''حلیہ محمد عربی'' شائع ہو چکی ہیں جن کو کافی پذیرائی ملی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب صدائے دل بھی ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی ترجمان ہے۔ مفتی نورالاسلام لکھتے ہیں ''عمر حیات صاحب نے بھی ایک نئے اسلوب سے صوفیانہ طرز پر دلوں کے تزکیہ وتہذیب کے لیے دل آویز نصیحتوں پر مبنی کتاب بعنوان ''صدائے دل'' تحریر فرمائی ہے جس کا اگر یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو یہ کتاب ان شاءاللہ انسان کو راہِ راست پر لانے کے لیے پیرِ کامل کا کام کر سکتی ہے۔

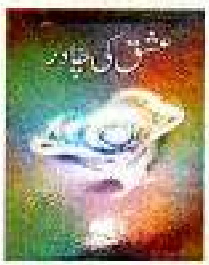

عامر سہیل کا نام ادبی دُنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اُن کے متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جنھیں ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ملی۔ ''عشق کا تیوہار'' کو پروین شاکر ایوارڈ بھی ملا۔ عشق کی چادر اُن کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔ معروف ناول نگار عبداللہ حسین اُن کے بارے میں لکھتے ہیں ''عامر سہیل کی آواز نئی بھی ہے اور انوکھی بھی۔ اُمید ہے کہ یہ آواز پھیلتی جائے گی۔'' ''عشق کی چادر'' کی اشاعت کا اہتمام جو ہرسنز نے کیا ہے۔ اُمید ہے یہ شعری مجموعہ بھی عامر سہیل کے دیگر مجموعوں کی طرح ادبی حلقوں کی توجہ حاصل کر پائے گا۔

نوجوان شاعرہ ہما گل کا پہلا شعری مجموعہ ''محبت اس کو کہتے ہیں'' شائع ہو گیا ہے۔ اس شعری مجموعے کی اشاعت کا اہتمام دُعا پبلی کیشنز لاہور نے کیا ہے۔ اس شعری مجموعے میں غزلیں، نظمیں اور نثری نظمیں شامل ہیں۔ معروف شاعرہ گلشن آرا اس کے بارے میں لکھتی ہیں ''ہما گل کی نظموں اور غزلوں میں فکری راستی اظہار کے برملا انداز کے ساتھ ملتی ہے'' اس خوبصورت شعری مجموعے کی قیمت صرف 200 روپے ہے۔

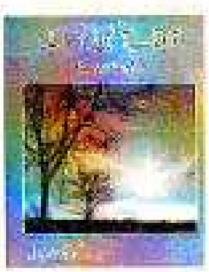

''آفتاب آگہی کا سلسلہ'' معروف بزرگ شاعر گوہر ملسیانی کا مجموعہ غزلیات ہے۔ گوہر ملسیانی طویل عرصہ سے نعت اور غزل کہہ رہے ہیں۔ سیرت کے حوالے سے لکھی گئی اُن کی کتب کافی مقبول ہیں۔ گوہر ملسیانی کے اثبات فکر وفن اور احیائے حیات وکائنات کا تعلق اس روشنی سے ہے جو نہ صرف اس کے تصورات وتخیلات کی اساس ہے بلکہ جو ہمہ وقت اُس کی شاعری میں ضوفشاں ہے۔ اس خوبصورت شعری مجموعے کی اشاعت کا اہتمام رنگِ ادب پبلی کیشنز کراچی نے کیا ہے۔ قیمت 300 روپے ہے۔

''272نشتر'' اُردو اور پنجابی کے معروف شاعر محمد عباس مرزا کے منتخب پنجابی اشعار پر مشتمل کتاب ہے۔ اُن کا دعویٰ کافی حد تک درست بھی ہے زیادہ تر اشعار نہایت خوبصورت اور باکمال ہیں۔ محمد منشا ساجد نے اُن کی فن و شخصیت کے حوالے سے بھرپور مضمون لکھا ہے جو شاملِ کتاب ہے۔ ان اشعار کا انتخاب بھی محمد منشا ساجد نے کیا ہے۔ جبکہ اشاعت کا اہتمام گلشن ادب پبلی کیشنز آؤٹ فال روڈ لاہور نے کیا ہے۔

''نسخہ ہائے لطافت'' سعودی عرب میں مقیم معروف شاعر محمد ایوب صابر کی طنز و مزاح کے حوالے سے کتاب ہے۔ شاعری میں تو اُن کی خوبصورت غزلیں اپنی پہچان آپ ہیں۔ اب اُنھوں نے طنز و مزاح کے حوالے سے نہایت شگفتہ مضامین لکھ کر اپنے قارئین کو کتاب کی صورت میں بہترین تحفہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں 30 مضامین شامل ہیں۔ اشاعت کا اہتمام دُعا پبلی کیشنز لاہور نے کیا ہے۔

''انقلاب پاکستان'' معروف دانشور کرنل فرخ کی کتاب ہے۔ کرنل فرخ ایک دردِ دل رکھنے والے پاکستانی ہیں۔ وہ پاکستان کی موجودہ صورتحال سے پریشان ہیں مگر اُن کی یہ پریشانی انھیں مایوسی کی طرف لے کر نہیں گئی۔ کیونکہ اُن کے پاس ایک ایسا راستہ اور اُمید کی کرن ہے جو پاکستان کو موجودہ صورتحال اور مسائل سے نکال سکتی ہے۔ اسی حوالے سے اُن کے لکھے گئے کالم اور مضامین کو کتابی صورت میں یکجا کر کے ''انقلاب پاکستان'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اگر یہ کتاب مقتدر حلقوں تک پہنچتی ہے تو وہ اس سے کماحقہ استفادہ کر سکتے ہیں۔

معروف شاعر، ادیب اور صحافی سیّد نوید حیدر ہاشمی کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے ادبی جریدے حرف کا تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے۔ ''حرف'' کوئٹہ سے شائع ہوتا ہے جو کہ مواد اور معیار کے لحاظ سے پاکستان کا نمائندہ ادبی پرچہ ہے۔ ''حرف'' سیّد نوید حیدر ہاشمی کی مدیرانہ صلاحیتوں کا بھرپور نمونہ ہے۔ بہت کم عرصہ میں اس نے سنجیدہ ادبی حلقوں میں توجہ حاصل کر لی ہے اور اب اُردو ادب کے نامور ادیبوں کی تازہ تخلیقات اس میں شامل ہوتی ہیں۔

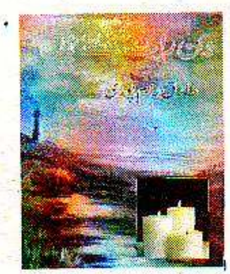

''دن رات سلگتے ہیں'' معروف شاعر ''طارق رام پوری'' کا مجموعہ کلام ہے۔ جس میں ایک سو ساٹھ سے زائد غزلیات اور کچھ قطعات اور ماہیے شامل ہیں۔ طارق رام پوری کا شمار کراچی کے معروف شعراء میں ہوتا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اُن کی عمر بھر کی ریاضت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس خوبصورت شعری مجموعے کی اشاعت کا اہتمام ''جران اشاعت گھر'' کراچی نے کیا ہے۔ 200 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 300 روپے ہے۔

ارشد ملک کا شمار نوجوان نسل کے مقبول شعراء میں ہوتا ہے۔ خود تو وہ باکمال شاعر ہیں لیکن ادبی حوالے سے اُن کا ایک اور Contribution ہے جو کہ بہت اہم ہے۔ وہ ہے مقبولِ عام شعری انتخاب۔ بلاشبہ اُن کے مرتب کردہ شعری انتخاب ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔ اس طرح بہت سے نوجوان شعراء کے کلام کو انھوں نے متعارف کرایا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں سب سے جدا رکھنا ہے۔ اُن کا مرتب کردہ شعری انتخاب ہے جسے رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز راولپنڈی نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

''سیّد اذلان شاہ'' کی زیرادارت گوجرہ سے شائع ہونے والا پرچہ ''نزول'' اپنا معیار اور مقدار کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سیّد اذلان شاہ کی شاعرانہ صلاحیتوں اور جمالیاتی شعور کا بھرپور عکاس ہے۔ اس کے ابھی صرف چھ شمارے شائع ہوئے ہیں لیکن اس نے بین الاقوامی سطح پر اپنی پہچان بنالی ہے۔ تمام ادبی سلسلے بہت معلوماتی اور تخلیقی ہیں۔ قارئین نزول میں اشاعت کے لیے اپنی تخلیقات درج ذیل پتہ پر ارسال کرسکتے ہیں۔ نزول۔ پی او بکس نمبر 18 جی پی او گوجرہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

معروف شاعر خالد علیم اور محمد شکور کے زیرادارت فانوس کا تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے۔ اس میں حمد و نعت مقالات، غزلیں، گفتگو، نظمیں، افسانے اختر عثمان کی طویل نظم ''تراش'' اور شاہین عباس کی شاعری کے حوالے سے تنقیدی گوشہ ''سخن ور'' کے عنوان سے شامل ہے۔ ''فانوس'' کو سنجیدہ ادب کا ترجمان کہا جاتا ہے۔ خالد علی کی مدیرانہ صلاحیتوں کے سبب اس میں نکھار آتا جارہا ہے۔

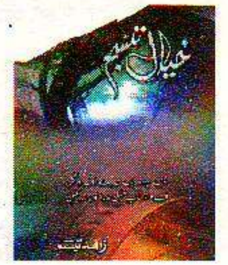

''خیال تبسم'' نوجوان شاعر زاہد تبسم کا شعری مجموعہ جس میں قطعات، رباعیات، اشعار اور نثری نظمیں شامل ہیں۔ جمیل حسین جمیل اُن کے بارے میں لکھتے ہیں ''کلام شاعر میں جدت شگفتگی لوچ و لچک کی بھرمار ہے۔ عشق توحید و رسالت دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کتاب کی اشاعت کا اہتمام نہایت سلیقے سے کیا گیا ہے۔

''سبط گل'' معروف شاعر زاہد تبسم کی غزلیات پر مشتمل مجموعہ کلام ہے۔ حرف تحسین میں محسن رضی اُن کی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں ''ان کے تمام اشعار میں دُنیا کے ہر آدمی کی جھلک نظر آتی ہے۔ بنیادی طور پر حقیقت شناسی ان کی شاعری کا حاصل ہے جن میں عشق و محبت کے سوا باقی امورِ زندگی سے متعلق بھی آپ کو لاتعداد اشعار پڑھنے کو ملیں گے جن کو شائستگی کے ساتھ زاہد تبسم نے اپنے دل نشین لہجے میں بیان کیا ہے۔''

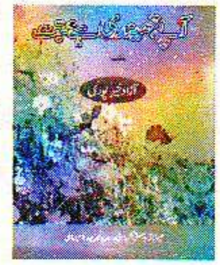

''بہاولپور'' کی تحصیل خیر پور ٹامے والی کی سرزمین ادبی حوالے سے بہت زرخیز ہے۔ چھوٹے سے اس شہر میں ۲۵ سے زائد اُردو اور سرائیکی کے شاعر ہیں۔ یہ سارا فیض سرائیکی کے نامور شاعر صاحبزادہ ریاض احمد رحمانی سے حاصل ہوا۔ ''آپ تھیندی ہے محبت'' خیر پور کے معروف شاعر آزاد خیر پوری کا پہلا سرائیکی شعری مجموعہ ہے۔ اس میں اُن کی اب تک کی لکھی گئی سرائیکی شاعری کا انتخاب شامل ہے۔ کتاب سے متعلق پروفیسر ڈاکٹر نواز کاوش، صاحبزادہ رشید عثمانی اور ظفر بھٹی کی آراء شامل ہیں۔ اس خوبصورت شعری مجموعے کی اشاعت کا اہتمام ''سرائیکی ادبی وسوں'' خیر پور ٹامے والی نے کیا ہے۔

قمر رضا شہزاد جدید غزل کے نہایت معتبر شاعر ہیں۔ ''یاد دہانی'' اُن کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل اُن کے دو شعری مجموعے ''پیاس بھرا مشکیزہ'' اور ''ہارا ہوا عشق'' شائع ہو چکے ہیں۔ قمر رضا شہزاد کو 80ء کی دہائی میں منظرِ عام پر آنے والے شعراء میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔ غزل میں وہ اپنے منفرد موضوعات اور تیکھے لہجے کے شاعر کے رُوپ میں وارد ہوئے۔ اُن کو ادبی اور عوامی حلقوں میں زبردست پذیرائی ملی۔ زیرِ تبصرہ مجموعے کی شاعری بھی اُن کے دیگر مجموعوں کی طرح نہایت اعلیٰ ہے اور ادبی ذوق رکھنے والے حضرات کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے۔

ثمینہ گل کا تازہ شعری مجموعہ ''آنچل کی اوٹ سے'' شائع ہوگیا ہے۔ ثمینہ گل کی شاعری نسوانی جذبوں اور اُمنگوں کی بھرپور ترجمان ہے۔ ثمینہ گل کی شاعری کے حوالے سے کتاب پر عطاء الحق قاسمی، حسن عباسی، فرحت عباس شاہ اور شاہدہ لطیف کے آراء شامل ہیں۔ عطاء الحق قاسمی اُن کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں ''ثمینہ گل کا یہ شعری مجموعہ اُس کے لیے کامرانیوں کی پہلی سیڑھی ثابت ہوگا۔ اُس نے کافی فاصلہ طے کرلیا ہے اور اس سے زیادہ اُسے طے کرنا ہے۔'' یہ کتاب مغل پبلشنگ ہاؤس نے شائع کی ہے۔

نامہ ہائے احباب

بہت محترم حسن عباسی صاحب! سلامت رہیں
السلام علیکم! اللہ کرے آپ بخیریت ہوں! آمین
چند روز پہلے ''ارژنگ'' جون کا خوبصورت مجلّہ ڈاک سے موصول ہوا۔ لفافہ پر مرسل کا نام رانا بابر حسین ممبر صوبائی اسمبلی پنجاب لکھا ہے۔ سوچتا ہوں کس کا شکر یہ ادا کروں آپ کا یا رانا صاحب کا۔ بہرحال میں آپ دونوں محترم حضرات کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے ناچیز کو یاد رکھا۔ ''ارژنگ'' کے سرورق اور اس کے متوازی رنگوں نے متاثر کیا ہے۔ باقی مندرجات اور کمپوزنگ بہت نفاست کا مظہر ہے۔ یقیناً اس کے پیچھے آپ کی شاعرانہ نفاست اور سلیقہ مندی کارفرما ہے۔ ایک شاعر کے بارے میں لوگ جو بھی کہیں ان کی اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایک اچھا شاعر خوش سلیقہ ضرور ہوتا ہے۔ ''ارژنگ'' اس کا مظہر ہے۔ یوں تو پہلے بھی ارژنگ کے شمارے ملتے رہے ہیں مگر اب کے سرورق نے تو بہت متاثر کیا ہے۔ باقی ترتیب وتزئین اور کمپوزنگ بھی قابل تحسین ہے۔ البتہ تصاویر واضح نہیں ہیں۔ نقوش بھی سیاہی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اگر تصاویر کسی بہتر انداز میں چھپ سکیں تو اچھا ہو۔ تصاویر کی ایک اور صورت بھی ہو سکتی ہے۔ رنگین تصاویر ایک ہی صفحہ پر اکٹھی شائع کی جا سکتی ہیں جو سرورق کا اندرونی یا آخری ورق کا اندرونی صفحہ بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ آپ کی صوابدید و گنجائش پر منحصر ہے۔ والسلام
دعا گو
سلطان سکون

❀❀❀

ارژنگ نظر حسن عباسی شاعر بے بدل
السلام علیکم! ارژنگ نے تو ذوق وشوق میں شیشہ آلات سجا دیا۔ خوب پر رونق رسالہ ہے۔ آپ نے ''درکنار'' سے حرف لے کر ایک گوشہ کا اہتمام کیا اس نظر عنایت کے لیے شکر گزار ہوں۔ ''درکنار'' جہاں بھی ذکر ہوا ہے مختلف اشعار کے حوالے سے ہوا ہے۔ آپ نے بھی اچھی نظر ڈالی ہے۔
دُنیائے ادب نے غزل

اُٹھا وہ شور گئی گردنیں عزیزوں کی
تری گرہ سے خزانہ کی چابیاں نہ گئیں

چنی ہے بقولہ اس کا ذکر کہیں انٹرنٹ پر بھی ہوا ہے۔ پھر یہ غزل بھی مذکور ہوئی ہے:

اپنی اولاد کے چہرے دیکھے
کبھی اصغر کبھی اکبر دیکھا

بیاض مئی ۲۰۰۹ء کے درکنار کے حصے میں ممتاز شاعر نجیب احمد نے ۵۳ غزلوں کی اس کتاب سے قریب قریب نوے شعر منتخب کر کے شائع کرائے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کے خاکے ضمیر جعفری میں احمد ندیم قاسمی کا ذکر بھی ہے۔ میرے لیے یہ بڑا نام ہے۔ اس نام سے از حد اطمینان ہوا۔ انہوں نے ہزارے کے اہل قلم کو خصوصی توجہ کا مستحق ٹھہرایا اور فنون میں ہمیشہ عزت دی۔ میں ان کی ذرہ نوازی سے خاک سے پاک ہوا ہوں۔ تقدیم و تاخیر کے باب میں ان کا مناسب سلوک مجھے حاصل رہا ہے۔ ''ارژنگ'' کا معیار آپ کی محنت سے خاصا اچھا ہے۔ نرا گلیمر ہی نہیں مضامین نظم و نثر کی رعنائیاں بھی بدرجہ اتم جنت نگاہ ہیں۔ ماشاء اللہ
مخلص
آصف ثاقب

❀❀❀

محترمی حسن عباسی صاحب!
السلام علیکم!
ماہ نامہ ''ارژنگ'' کے لیے چند غزلیں اشاعت کے لیے ارسالِ خدمت ہیں۔ جون کا ''ارژنگ'' مل گیا تھا۔ کرم فرمائی کا شکریہ
فقط والسلام
نصرت صدیقی

❀❀❀

محترم حسن عباسی صاحب!
جتنے خوبصورت اشعار کہتے ہیں اتنا ہی اچھا اور معیاری ''ارژنگ'' ہے۔ آپ سے ایسے ہی کام کی اُمید تھی۔ یہ اگرچہ کافی مشکل ہے لیکن اُمید واثق ہے کہ آپ یہ کارِمحال آسانی سے کرلیں گے۔ آپ کے لیے ڈھیر ساری دُعائیں صغریٰ صدف اور دیگر احباب کی خدمت میں سلام۔
خیر اندیش
نورین طلعت عروبہ
راولپنڈی

❀❀❀

برادرِ عزیز حسن عباسی صاحب
السلام علیکم! ''ارژنگ'' ملا۔ سبحان اللہ! حسن ترتیب اور جمالِ طباعت ہر ''پیکر تصویر'' سے چھلکا پڑتا ہے۔ انتخاب نظم ونثر نمائندہ اور معیاری۔ وہ جو میری آپ سے گفتگو ہوتی تھی ادب کی رسائی اور عوام میں پھیلاؤ کے موضوع پر۔ تو ''ارژنگ'' کا انتخاب وترتیب اُسی مطابق نظر آیا۔
شعراء کے شعری گوشوں کا اہتمام قابل داد ہے۔ یہ طریقہ بھی پسند آیا۔ ''ایڈیٹر کی ڈائری'' میں میرے گاؤں گوندلانوالہ میں منعقد ہونے والے مشاعرے کا ذکر کر کے آپ نے میرے پورے گاؤں کا نام روشن کر دیا ہے۔ ہم آئندہ بھی ایسے ہی عمدہ مشاعرے کروانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔
نثر کا انتخاب بھی اچھا تھا۔ اُمید ہے کہ نہ صرف یہ رسالہ اس نئے رنگ ڈھنگ میں آگے بڑھتا رہے گا بلکہ مزید ندرتِ طباعت کا مظاہرہ کرے گا۔
برادرم عامر بن علی شاعر تو خوبصورت ہیں ہی، انسان بھی بہت اعلیٰ ہیں۔ اُن کا کلام ان کی شخصیت کی طرح دلکش اور اس پرچے کا دامن اُن کی وسعت قلبی کی طرح وسیع ہے۔

ان کی خدمت میں سلام و تحسین۔ تازہ شمارے کے لیے کچھ تازہ چیزیں ملفوف ہیں دیکھ لیں۔

شہزاد نیر

آزاد کشمیر

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

آداب! آپ نے جنوری ۲۰۱۲ء کے شمارے میں میرا گوشہ شائع کر کے احسان فرمایا۔ میں دلی طور پر آپ کا ممنون ہوں۔ علی رضا کے ذریعے سے آپ سے فون پر رابطہ ہوا تھا۔ آپ کا تعلق بہاولپور سے ہے یہ میرے لیے اور زیادہ خوشی کی بات ہے۔ ''نستعلیق'' ادارے سے آپ کتب کی اشاعت بھی کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ کتاب شائع کرنے کا پروگرام بنا تو آپ سے تعاون لوں گا۔ اب ایک غزل پیش خدمت ہے۔ اسے ''ارژنگ'' کے کسی کونے میں لگا کر ممنون فرمائیں۔ والسلام

اسلم سحاب ہاشمی

ساہیوال

محترمی! السلام علیکم!

میں اپنے درج ذیل دوسرے شعری مجموعے کی دو کاپیاں آپ کو بغرضِ تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔

''دن رات سلگتے ہیں'' اُمید ہے کہ تبصرہ شائع کر کے آپ مجھے شکریے کا موقع دیں گے۔ والسلام

طارق رام پوری

کراچی

محترم حسن عباسی!

السلام علیکم! آپ کے ارسال کردہ ''ارژنگ'' کے دو رسائل موصول ہوئے۔ میں بہت مشکور ہوں۔ ''ارژنگ'' کا معیار اور آپ کی اور عامر بن علی صاحب کی کاوشیں قابل تحسین ہیں۔ نظم اور نثر دونوں کا انتخاب خوبصورت ہے۔ کسی ایک رسالے میں اتنی زیادہ خوبصورت اور معیاری شاعری بہترین ادبی معیار کا ثبوت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری غزلیں اس شمارے کا حصہ بنی ہیں۔ والسلام

کامران اقبال اعظم

ڈنمارک

پیارے دوست! عامر بن علی اور حسن عباسی

اللہ آپ کو شاد آباد رکھے۔ آپ کا نیا شمارہ ''ارژنگ'' اپنے خوبصورت سرورق کے ساتھ میرے ہاتھوں میں ہے۔ اتنا معیاری اور خوبصورت شمارہ شائع کرنے پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اپنی ۲ غزلیں آپ کو بھجوا رہا ہوں۔ اگر پسند آئیں تو اگلے شمارے میں شامل کر لیجیے گا۔

ارشد ملک

راولپنڈی

برادرم جناب حسن عباسی!

السلام علیکم! اُمید واثق ہے کہ رب ذوالجلال کے فضل و کرم سے بخیریت ہوں گے۔

''ارژنگ'' کا تازہ شمارہ مل گیا ہے۔ بہت شکریہ! آپ کے حکم کے مطابق اپنا کچھ تازہ کلام بھیج رہا ہوں۔ اگر کسی قابل سمجھیں تو شامل اشاعت کر لیجیے گا۔ بہت شکریہ!

والسلام

ارشد محمود ارشد

سرگودھا

میرے اپنے بھائی حسن عباسی صاحب

السلام علیکم! حسب وعدہ اپنی نگارشات کے ساتھ آپ سے مخاطب ہونے کی خوشی حاصل کر رہا ہوں۔

حسن بھائی! اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی کی ہمیشہ سچی خوشیوں سے نوازے۔ اس وقت میرے جو بھی مہربان آپ کے قریب بیٹھے ہیں ان صاحب کی خدمت میں میرا نیازمندانہ سلام۔ خدا آپ کو زندگی کی بھرپور خوشیاں دے۔ آمین

آپ کو چاہنے والا فقیر

دستگیر شہزاد

محترم جناب مدیر اعلیٰ عامر بن علی صاحب! اور حسن عباسی صاحب! سلام و رحمت

آپ کی محبتیں ''ارژنگ'' کا پیراہن اوڑھے ایک عرصے سے دل و دماغ کو مہکا رہی ہیں۔ ان محبتوں کا احسان چکانے کے قابل تو نہیں ہوں میں صرف دعا ہی کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے اور ''ارژنگ'' آپ کے زیرِ سایہ اسی طرح کامیابی کا سفر طے کرتا رہے۔ آمین۔ ''ارژنگ'' کے ہر گوشے میں قارئین کی دلچسپی اور اہل قلم کی وابستگی واضح نظر آتی ہے۔

میری خوش قسمتی ہوگی اگر مجھے بھی ''ارژنگ'' میں ایک گوشہ مل جائے۔ میرا پہلا شعری مجموعہ ''پہلی سانس محبت کی'' فروری ۲۰۰۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ''فنون'' سے اشاعت کا سفر ۲۰۰۱ء میں شروع کیا تھا۔ قاسمی صاحب کی وفات کے بعد اشاعتی سفر میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا۔ اُمید ہے ''ارژنگ'' جیسا معیاری ادبی جریدہ مجھے اپنا ہم سفر بنانے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کرے گا۔

آپ کا مخلص

محمد ضیاء اللہ قریشی

میانوالی

دانائے روزگار! حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم! ماہنامہ ''ارژنگ'' ملا۔ اچھی چیزیں پڑھنے کو ملیں۔ آپ کی محبت اور شفقت کا پہلے ممنون تھا اب سراپا سپاس بھی ہوں۔ آپ کے حکم کے مطابق ۶ عدد غزلیں حاضر خدمت ہیں۔ اُمید کرتا ہوں پسند فرمائیں گے۔ اپنا تعارف بھی لکھے دیتا ہوں۔ غزلوں کے ساتھ آپ کی رائے جو ''ارژنگ'' میں دی جا رہی ہے خوب ہے۔ والسلام

آپ کا اپنا

اقرار مصطفیٰ

یادیں

شیزان ہوٹل (دوحہ) دائیں سے بائیں عزم بہزاد مرحوم، حسن عباسی،
ملک مصیب الرحمن (مرحوم)، پروفیسر عنایت علی خاں اور ڈاکٹر اختر شمار

دبئی کے عالمی مشاعرہ میں دائیں سے بائیں گلنار آفریں، امجد اسلام امجد،
عطاء الحق قاسمی، امجد اقبال امجد، حسن عباسی اور عزیز احمد

ہالیڈے ان لاہور دائیں سے بائیں عامر بن علی، اعزاز احمد آذر،
شہباز انور، حافظ مظفر محسن، ابرار ندیم، افتخار مجاز اور حسن عباسی

حلقۂ پاسبانِ ادب لاہور کے زیر اہتمام تقریب ایوارڈ میں حسن عباسی بہترین سفرنامہ نگار
کا ایوارڈ معروف شاعر اقبال راہی سے وصول کرتے ہوئے۔ چیئرمین حلقۂ پاسبانِ ادب حُسن بانو ہمراہ

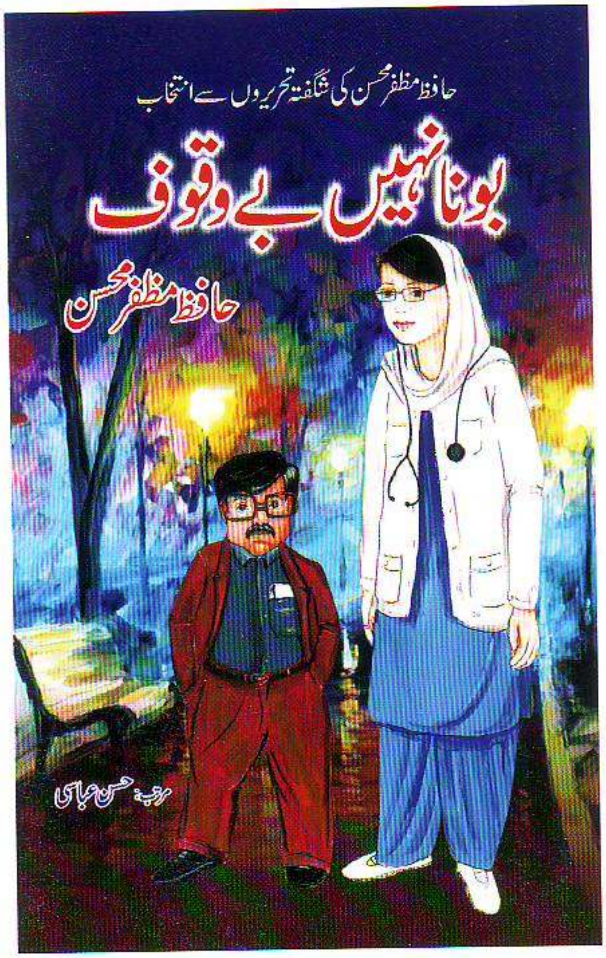

نامور مزاح نگار حافظ مظفر محسن کی شگفتہ تحریروں سے انتخاب

''بونا نہیں بے وقوف''

مکمل اہتمام سے شائع ہوگئی ہے۔

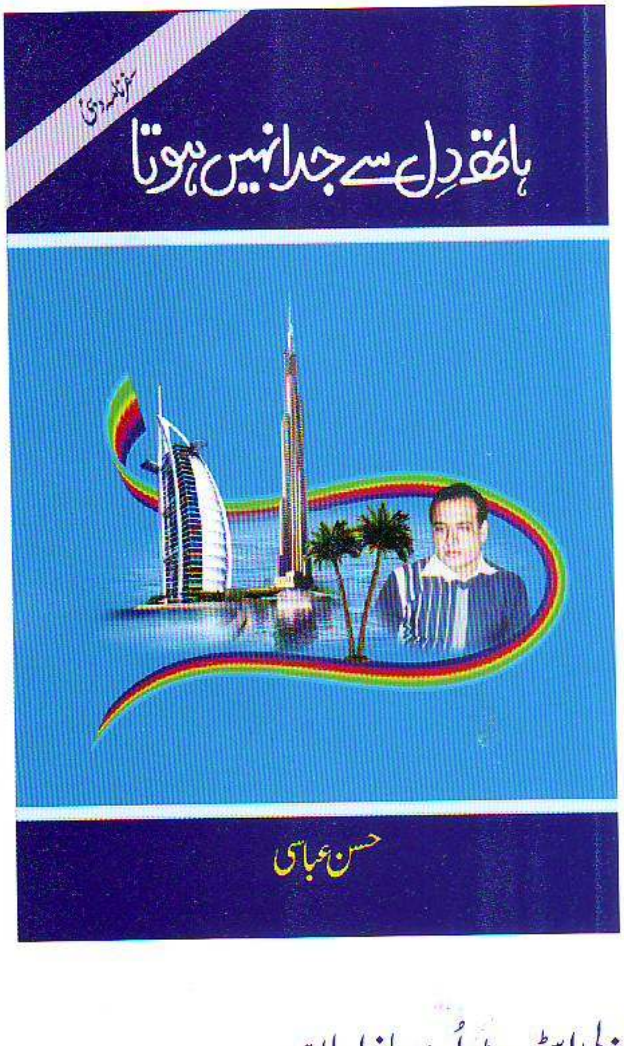

نامور شاعر اور سفرنامہ نگار حسن عباسی کا دوسرا سفرنامہ

''ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا''

شائع ہوگیا ہے

ناشر نستعلیق مطبوعات F-3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اُردو بازار لاہور

0300-4489310

نامور ادیبوں کے منفرد انٹرویوز پر مشتمل کتاب

"گفتگو" کا دوسرا ایڈیشن

ڈاکٹر سلیم اختر
احمد ندیم قاسمی
عطاء الحق قاسمی
منیر نیازی
ممتاز راشد
ظفر اقبال
مشتاق احمد یوسفی
اشفاق احمد
خالد مسعود خان
شہزاد احمد
انور مسعود
احمد عقیل روبی
ڈاکٹر انعام الحق جاوید
خالد علیم
علیم ناصری
اعجاز رضوی
سلیم طاہر
ڈاکٹر انور سجاد
نوشی گیلانی
بشریٰ اعجاز
اسلم کولسری
بیدل حیدری
اعزاز احمد آذر
حسن عباسی
عامر بن علی
محمد اکرم اعوان
سیف اللہ خالد
اظہر غوری
وصی شاہ
فرحت عباس شاہ

Read Online
www.amirbinali.com
www.millat.com